مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
مشرف علی تھانوی

مدیر
خلیل احمد تھانوی

جلد ۳	ذی القعدہ ۱۴۲۲ھ / فروری ۲۰۰۲ء	شمارہ ۳

تکمیل الانعام
فی
صورۃ ذبح الاَنعام

(قربانی کامل انعام الٰہی ہے)

از افادات: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی: مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۱۰ روپیہ

زر سالانہ =/۱۰۰ روپے

پتہ دفتر۔
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون نمبر ۴۴۸۰۶۰
۵۴۲۲۲۱۳

ماہنامہ
الامداد

ناشر: مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ار بی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

(قربانی کامل انعام الٰہی ہے)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے یہ وعظ ۲ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کھڑے ہو کر دو ۲ گھنٹے پچاس منٹ ارشاد فرمایا۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ

تکمیل الانعام

فی

صورۃ ذبح الانعام

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم ۔ اما بعد : فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماء ھا ولکن ینالہ التقوٰی منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ھدیکم وبشر المحسنین ☆(۱)

تمہید

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہدایا اور ضحایا(۲) کی حکمت بیان فرمائی ہے اور جو اس سے مقصود ہے اس پر متنبہ فرمایا ہے اس سے پہلے چند آیتوں میں یہ مضمون مذکور ہے چنانچہ

---

(۱) سورۃ الحج آیت ۳۷ (۲) ہدی اس قربانی کو کہتے ہیں جو حاجی حج کی قربانی کرتا ہے اور ضحایا اس قربانی کو کہتے ہیں جو بقرعید کے موقع پر کی جاتی ہے۔

اس سے اوپر یہ آیت ہے:

ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکر وا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام والٰھکم الٰہ واحد فلہ اسلموا وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم والصٰبرین علیٰ ما اصابھم والمقیمی الصلوٰۃ ومما رزقنھم ینفقون ☆(۱)

مجموعۂ آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایا اور ضحایا سے مقصود تقرب الی اللہ ہے جس کو کہیں بعنوان ذکر اسم اللہ (۲) بیان فرمایا کہیں تقوی سے تعبیر فرمایا ہے۔ مقصود مشترک سب میں تقرب الی اللہ (۳) ہے اور یہی راز ہے سب عبادتوں کا مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ ہے گو اس جگہ حج کی قربانی کا ذکر ہے مگر جو حکمتیں اس جگہ مذکور ہیں ان کو حج ہی کی قربانی سے خصوصیت نہیں بلکہ وہ سب قربانیوں میں مشترک ہیں (۴) گو حج کے انضمام (۵) سے اس میں اور قوت بڑھ جاوے گی جیسے تقرب یوں تو تمام طاعات میں مشترک ہے مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ قوت کے ساتھ ہے پس اس میں شک نہیں کہ جو قربانی کے ساتھ ہوگی اس میں برکت اور زیادہ ہوگی مگر یہ مقصود اور حکمتیں جو اس جگہ مذکور ہیں اسی کے ساتھ خاص نہیں اور میں نے قربانی کی روح کا بیان کرنا اس وقت اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس سے پہلے بھی چند بیان ہو چکے ہیں جن میں بعض اعمال کی ارواح کا ذکر ہوا تھا چنانچہ رمضان کے بیانات میں اعمال رمضان کی روح مجاہدہ اور عید کے بیان میں اعمال حج کی روح مشاہدہ ہونا ثابت کیا تھا۔ اس لئے جی چاہا کہ قربانی کی بھی روح بیان کر دوں۔

---

(۱) سورۃ الحج آیت ۳۴، ۳۵ (۲) کہیں اس عنوان سے ذکر کیا ہے کہ ان پر اللہ کا نام لیا جائے (۳) سب سے مقصود اللہ کا قرب حاصل کرنا (۴) جو حکمتیں یہاں ذکر کی گئی ہیں وہ حج کی قربانی کی خصوصیت نہیں بلکہ سب قربانیوں میں پائی جاتی ہیں (۵) ملنے کی وجہ سے۔

تربیت فرعی و عقلی

چنانچہ اس کی روح تقرب الی اللہ ہے جس کے دو درجے ہیں ایک فناء(۱) ایک بقاء(۲) اول فناء ہوتی ہے پھر بقاء حاصل ہوتی ہے اور ان سب ارواح میں ترتیب وقوعی کی ساتھ ترتیب عقلی بھی ہے یعنی جیسے عقلاً مجاہدہ پہلے ہوتا ہے اس کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے ایسے ہی یہاں وقوعاً رمضان کے بعد حج ہوتا ہے۔

جس کی حقیقت مشاہدہ(۳) ہے گو شوال میں افعال حج مشروع نہیں ہوتے مگر احرام جو شرط اعظم ہے شوال ہی سے شروع ہو جاتا ہے یعنی سُنیت اس کی شوال سے ہوتی ہے اسی طرح یہاں قربانی کا زمانہ حج کے بعد ہے کیونکہ وہ دسویں ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے اور حج عرفہ کے دن نویں کو ہوتا ہے یہ تو ترتیب وقوعی(۴) ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترتیب وقوعی کے ساتھ حج و قربانی کی ارواح میں ترتیب عقلی بھی ہے یعنی جو روح مطلق اعمال حج کے متعلق ہے وہ قربانی کی روح سے مقدم(۵) ہے۔ یہ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالیٰ نے ہماری ساتھ اکثر ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرمایا ہے تو اب دیکھئے کہ جب ہم کسی بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں تو اول مجاہدہ ہوتا ہے مثلاً چلنے کی مشقت کوشش اور سفارش کی مشقت اور بادشاہ کی ملاقات کے قابل کسی ہنر کے حاصل کرنے کی مشقت اس کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے جس مشاہدہ کے بھی ہم قابل ہوں خواہ بلا حجاب خواہ من وراء حجاب(۶) اس کے بعد پھر تقرب خاص کا معاملہ(۷) ہوتا ہے کہ ہم بادشاہ کے سامنے نذرانہ پیش کرتے ہیں پھر بادشاہ کی طرف سے ہم پر عطا ہوتی ہے اور بادشاہ کی عطا ہمارے

---

(۱) ایک مٹانا (۲) ایک باقی رہنا (۳) اللہ کی عنایات کا مشاہدہ کرتا ہے (۴) یعنی حج پہلے واقع ہوتا ہے پھر قربانی (۵) پہلے ہے (۶) خواہ بغیر پردہ کے آمنے سامنے یا پردے کے پیچھے سے (۷) پھر خاص قرب کا معاملہ ہوتا ہے۔

نذرانہ سے بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ خزانہ عامرہ(۱) کا مالک ہے اور کریم بھی ہے نیز یہ بھی دستور ہے کہ شاہانِ دنیا نذرانہ کی اشرفی پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے ہیں لیتے نہیں ہیں پھر اپنے خزانے سے خود بہت کچھ دیتے ہیں اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کا برتاؤ ہماری ساتھ ہمارے مذاق کے موافق ہے تو ممکن ہے کہ وہاں بھی یہی ترتیب ہو چنانچہ رمضان کے افعال مجاہدہ تھے اور حج مشاہدہ ہے اس کے بعد یہاں بھی چاہئے کچھ نذرانہ ہماری طرف سے اور ادھر سے عطا ہو تو حج جو کہ مشاہدہ ہے اس کے اعمال میں سب بڑا عمل وقوف عرفہ ہے کہ بدوں(۲) اس کے حج ہو ہی نہیں سکتا اور یہ ایسا رکن ہے کہ اگر کسی سے یہ فوت ہو جائے تو پھر دوسرے سال تک حج کا موقعہ نہیں مل سکتا لہذا ظاہر یہ ہے کہ مشاہدہ کا مصداق وقوف عرفہ ہوا۔

جان کا نذرانہ

اس کے بعد دیکھنا چاہئے کہ کون سا عمل نذرانہ بننے کے قابل ہے گو عرفہ کے بعد وقوف مزدلفہ بھی ہے اور رمی(۳) بھی ہے اور قربانی بھی اور طواف بھی مگر ان میں نذرانہ بننے کے قابل بجز(۴) قربانی کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جیسا وہ دربار ہے ویسا ہی نذرانہ ہونا چاہئے اس نذرانہ کا اصل مقتضا تو یہ تھا کہ انسان اپنی جان پیش کر دے کیونکہ اس سے بڑی چیز انسان کے پاس کچھ نہیں کسی عاشق نے کعبہ کو دیکھ کر خوب کہا

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جانِ مضطر — کہ مباد بارِ دیگر نرسی بدیں تمنا(۵)

یہ کہہ کر دفعتاً گرا اور بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے رب البیت سے جاملا۔ مولانا اسی پر نظر کر کے فرماتے ہیں۔

---

(۱) بڑے خزانہ کا مالک ہے (۲) بغیر (۳) شیطان کو کنکری مارنا (۴) سوائے (۵) جب محبوب کے کوچے میں پہنچو تو اپنی بیقرار جان اس کے سپرد کر دو کہ شاید دوبارہ یہ تمنا حاصل نہ ہو۔

نان دادن خود سخائے صادق ست جان دادن خود سخائے عاشق ست (۱)

اور

حج زیارت کردن خانہ بود حجِ رب البیت مردانہ بود (۲)

اس کا حج مردانہ تھا کہ جان دے کر خدا تعالیٰ سے مل گیا جان کا سب سے زیادہ عزیز ہونا ظاہر و باہر (۳) ہے اس لئے اس دربار کے لائق نذرانہ یہی ہوسکتا ہے شرعاً بھی جان کو سب سے زیادہ عزیز مانا گیا ہے کہ جان والے کو بھی اس میں تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہے فرماتے ہیں " لا تقتلوا انفسکم " (۴) یعنی جس کی ظاہر میں یہ چیز ہے وہ بھی اس میں تصرف نہیں کرسکتا ایک دوسری آیت سے بھی یہ مضمون معلوم ہوتا ہے کہ جان سب سے زیادہ عزیز ہے فرماتے ہیں۔ "ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم ولو انھم فعلوا ما یوعظون بہ لکان خیراً لھم واشد تثبیتا ☆ واذا لاٰ تینٰھم من لدنا اجراً عظیما☆ ولھدینٰھم صراطاً مستقیماً ☆ " (۵)

کہ اگر ہم لوگوں پر یہ فرض کردیتے کہ اپنی جان دے دو یا گھروں سے نکل جاؤ تو بجز تھوڑے آدمیوں کے ایسا کوئی نہ کرتا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جان دینا بہت دشوار ہے انسان کو یہ سب سے زیادہ پیاری ہے اور خروج من الدیار (۶) بھی نفس اور جان ہی کی وجہ سے دشوار ہے کیونکہ گھر سے بے گھر ہونے میں روح کو تکلیف ہوتی ہے بلکہ قتل میں تو جان پر ایک ہی بار تصرف ہوتا ہے اور خروج من الدیار میں ہر وقت کا سوہانِ روح (۷) ہے دل پر

---

(۱) روٹی دینا خود بھی سخاوت ہے اور جان دینا سچے عشق کی علامت ہے (۲) بیت اللہ کی زیارت کرنے کا نام حج ہے اور رب البیت یعنی اللہ کی ملاقات اصل میں حج مردانہ ہے (۳) بالکل واضح ہے (۴) اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو (۵) سورۃ النساء آیت ۶۶ تا ۶۸ (۶) اور گھر سے نکلنا بھی (۷) ہر وقت دل کیلئے تکلیف کا باعث ہے۔

آرے سے ہر وقت چلتے ہیں یہی تو وجہ ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھ کو تمام انبیاء سے زیادہ ایذاء پہنچی ہے اس پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ آپ قتل نہیں ہوئے اور بعض انبیاء تو قتل بھی ہوئے ہیں جواب ظاہر ہے کہ قتل کی ایذاء(۱) ایک دفعہ ہی ہو جاتی ہے اور حضورؐ کو منجملہ (۲) اور اذیتوں کے ہجرت کر کے گھر سے بے گھر ہونا پڑا یہ اس سے اشد (۳) ہے الغرض انسان کو جان سب سے زیادہ پیاری ہے تو مشاہدہ حق جیسی دولت کا مقتضاء یہ تھا کہ اس کے نذرانہ میں ہم اپنی جان پیش کر دیتے مگر خدا تعالیٰ نے اس میں سہولت کر دی ہے کہ بڑی چیز کے بدلہ میں چھوٹی چیز لے لی ہے مگر وہ چھوٹی چیز ایسی ہونی چاہئے جس کو انسان کی جان سے مناسبت ہو۔

سو ظاہر ہے کہ جان سے مناسبت جان ہی کو ہے جسم کو نہیں اس لئے نفس انسانی کا فدیہ کوئی نفس ہی ہو سکتا ہے۔لہذا ذبح حیوان ہی اس کا بدلہ ہوا اور یہی قربانی ہے پس وقوف عرفہ کے بعد جتنے بھی افعال ہیں ان میں قربانی کے سوا اور کوئی فعل نذرانہ بننے کے قابل نہیں کیونکہ اصلی نذرانہ کے ساتھ اسی کو مناسبت ہے اور گو یہ اصلی نذرانہ کا بدل ہے مگر اس میں ثواب انشاء اللہ وہی ملے گا جو اپنی جان دینے میں ملتا۔

آثارِ کرم

جیسا کہ لیلۃ المعراج میں نمازیں اول پچاس فرض ہوئی تھیں ۔حضور ﷺ تو غایت عبدیت کی وجہ سے چپکے ہی چلے آئے مگر موسیٰ علیہ السلام پر آپ کا گزر ہوا تو انہوں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے آپکی اُمت پر کیا فرض کیا آپؐ نے فرمایا پچاس وقت کی نمازیں۔موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ حق تعالیٰ سے اپنی امت کے لئے تخفیف (۴) کی درخواست کریں کیونکہ آپکی امت میں اتنی طاقت نہیں یہ مطلب نہیں کہ کسی سے بھی نہ

(۱) تکلیف (۲) اور تکلیفوں کے ساتھ (۳) سخت (۴) کمی۔

ہو سکے گا بلکہ مطلب یہ تھا کہ اکثر سے نہ ہو سکے گا۔

اور یہ واقعہ بھی ہے کیونکہ بہت سے مسلمان پانچ وقت کی نمازیں بھی نہیں پڑھتے پچاس وقت کی تو بہت ہی کم لوگ پڑھتے اور اس میں حضرت موسیٰؑ کا ہم لوگوں پر غائبانہ احسان تھا کہ انہوں نے ہمارے لئے تخفیف کا مشورہ دیا چنانچہ حضور ﷺ موسیٰؑ کے فرمانے سے واپس ہوئے۔ اور تخفیف کی درخواست کی آپ کا دربار حق سے اولاً خاموش(۱) چلا آنا یہ بھی کرم کا اثر تھا اور حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے لوٹنا بھی کرم کا اثر تھا کیونکہ کرم کے آثار مختلف ہیں کریم کو حاکم کے احکام میں چون و چرا کرنے سے خجلت(۲) ہوتی ہے اور کسی کے مشورہ کرنے کو رد کرنے سے بھی حیا آتی ہے۔

ہمارے حاجی صاحب کو جو کوئی مشورہ دیتا تو ہر شخص کے مشورہ پر فرما دیتے اچھا جیسی مرضی چاہے وہ حضرت کی رائے کے موافق ہوتا یا خلاف کسی کی دل شکنی نہ فرماتے تھے ہر ایک کے جواب میں اچھا جیسی مرضی ہی فرماتے تھے اسی طرح حضورؐ کو موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ کے رد کرنے سے حیا آئی اور واپس تشریف لے جا کر تخفیف کی درخواست کی یہ اشکال نہ کیا جائے کہ خجلت عن الحق(۳) پر حیاء عن موسیٰ کیسے غالب آ گئی خجلت عن الحق کیوں نہ غالب ہوئی۔

جواب یہ ہے کہ آپ صاحب حال ہونے کی ساتھ عارف بھی ہیں آپؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ حق تعالیٰ مانگنے سے بہ نسبت نہ مانگنے کے زیادہ خوش ہوتے اس لئے اس وقت آپ نے واپسی کو ترجیح دی کیونکہ واپس نہ ہونے میں موسیٰ علیہ السلام کی دل شکنی(۴) کا احتمال تھا اور واپس ہونے میں حق تعالیٰ کی ناراضی کا اندیشہ نہ تھا صرف اپنی طبیعت اور مذاق

---

(۱) اللہ کے دربار سے خاموش چلے آنا (۲) حیل و حجت کرنے سے شرمندگی ہوتی ہے (۳) اللہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے شرمندہ ہونا کیسے غالب آیا (۴) دل ٹوٹنے۔

کی مخالفت تھی تو حضورؐ نے موسیٰؑ کی دلجوئی (۱) کے لئے اپنے مذاق کی مخالفت گوارا فرمائی اس وقت حضورؐ پر عجیب پس و پیش کی حالت گزری ہوگی کہ ادھر حق تعالیٰ سے بھی خجلت تھی اُدھر موسیٰؑ سے بھی حیا تھی چنانچہ قدرے تخفیف ہوگئی تو موسیٰؑ نے دوبارہ مراجعت (۲) کا مشورہ دیا یہاں تک کہ بار بار کی آمدورفت میں پینتالیس نمازیں کم کرائیں موسیٰؑ نے فرمایا کہ آپکی امت سے اتنا بھی نہ ہوگا اور تخفیف کرایئے حضورؐ نے فرمایا اب مجھے حق تعالیٰ سے شرم آتی ہے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس وقت اخیر میں آپ کو حیا مانع (۳) کیوں ہوئی پہلے کیوں نہ ہوئی۔

کاملین پر غلبہ حال

اس کا راز یہ ہے کہ بعض دفعہ کاملین پر بھی حالات کا غلبہ ہوتا ہے اس کے قبل میں بھی دوسروں کی طرح اس کا قائل تھا کہ کاملین پر احوال کا غلبہ نہیں ہوتا مگر الحمد للہ اب تحقیق بدل گئی اور معلوم ہوا کہ گاہے ان پر بھی غلبہ ہوتا ہے چنانچہ جنگ بدر میں جب حضورؐ نے مسلمانوں کے غلبہ کی دعا فرمائی تو اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

" اللهم ان تهلك هذه العصابة لم تعبدبعد اليوم "

(اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد کوئی آپکی عبادت نہ کریگا) حضورؐ کے درجہ پر نظر کرتے ہوئے یہ امر بعید (۴) سا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طرح کھل کر گفتگو فرمائیں مگر اس کا راز یہ ہے کہ مقربین کاملین کا کمال یہی ہے کہ بادشاہ کے مزاج شناس ہوں حق تعالیٰ تو مزاج سے پاک ہیں مگر وہاں تجلیات اور شیون بے انتہا (۵) ہیں جن کے مقتضیات (۶) مختلف ہیں عارف ان شیون اور تجلیات کے مقتضیٰ (۷) کی پوری

---

(۱) دل داری کے لئے (۲) واپس جانے کا مشورہ دیا (۳) حیا کیوں رکاوٹ بنی (۴) دور معلوم ہوتی ہے (۵) اللہ کی تجلیاں اور شانیں بہت ہیں (۶) تقاضے (۷) عارف ان حالتوں اور تجلیوں کے مقتضیٰ کی رعایت کرتا ہے۔

رعایت کرتا ہے جس وقت جو شان ظاہر ہوتی ہے اسی کے موافق گفتگو کرتا ہے اس وقت حضورؐ پر شان محبت اور تجلی محبوبیت کا غلبہ تھا آپؐ جانتے تھے کہ اس وقت حق تعالیٰ بھی چاہتے ہیں کہ میں ان پر ناز کروں اس لئے کھل کر ناز کرنے لگے۔

اسی طرح حضرت ایوبؑ جب بیمار ہوئے تو ایک زمانہ تک دعا نہ کی ان کی بیوی نے جن کا نام رحمت تھا دعا کیلئے عرض کیا کہ آپ کی بیماری کو بہت دن ہو گئے اب دعا صحت فرمایئے فرمایا کہ اسی برس تو بیماری میں گزرنے دو جتنے دنوں ہم نے راحت سے زندگی بسر کی ہے ابھی کیا جلدی ہے اس وقت آپ پر اس حالت کا غلبہ تھا کہ حق تعالیٰ میرا صبر دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے پورا صبر کیا حتیٰ کہ دعا بھی نہ کی حالانکہ دعا صبر کے منافی نہ تھی۔ مگر صورۃً اس میں بیماری سے ناگواری اور ضجر (۱) کا اظہار ہے پھر جب منکشف (۲) ہوا کہ جب حق تعالیٰ شان عبدیت کا اظہار چاہتے ہیں تو فوراً دعا کرنے لگے۔ " انی مسنی الشیطان بنصبٍ وعذاب " (۳) اور اس مصیبت کو شیطان کی طرف منسوب کرنے لگے۔

آدابِ اسناد

بظاہر یہاں شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے فاعل حقیقی کو چھوڑ کر فاعل مجازی کی طرف فعل کی نسبت کی حالانکہ صوفیہ کی بعض حکایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اسناد الی الغیر (۴) بھی شرک ہے چنانچہ جب حضرت بسطامیؒ کا انتقال ہوا اور وہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے تو سوال کیا گیا کہ ہمارے واسطے کیا لائے انہوں نے بہت سوچ کر عرض کیا کہ توحید لایا ہوں ارشاد ہوا "اما تذکر لیلۃ اللبن " وہ دودھ کی رات یاد نہیں رہی؟ قصہ

---

(۱) ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار ہے (۲) ان پر بات واضح ہوئی (۳) سورہ ص آیت ۴۱ (۴) غیر کی طرف نسبت کرنا بھی شرک ہے۔

یہ ہوا تھا کہ ایک رات آپ نے دودھ پیا تھا صبح کو پیٹ میں درد ہو گیا تو ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا کہ رات دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا اس پر مواخذہ (۱) ہوا کہ اسی برتے پر توحید کا دعویٰ کرتے ہو کہ درد کو دودھ کی طرف منسوب کرتے ہو۔ مگر اس طریق کے آداب بہت ہیں واقعی ایک وقت میں غیر کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے اور ایک وقت فاعل حقیقی کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے چنانچہ آدم علیہ السلام فرماتے ہیں "ربنا ظلمنا انفسنا" انہوں نے ظلم کی اسناد اپنے نفس کی طرف کی۔ سِیَر (۲) میں ہے کہ ان سے سوال ہوا کہ تم نے اس فعل کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا آدمؑ نے جواب میں عرض کیا ہے

گفت من ہم پاس آنت داشتم لیک من پاس ادب نگذاشتم

یعنی میں نے ادب کی رعایت کی اس لئے سیئہ (۳) کو اپنی طرف منسوب کیا آپ کی طرف منسوب نہ کیا اس پر جواب عنایت ہوا کہ پھر میں نے تمہارے ادب کی رعایت کی ۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں

"والذی ھو یطعمنی ویسقین ☆ واذا مرضت فھو یشفین ☆ (اطعام، اسقاء، (۴) وشفاء کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور مرض کو اپنی طرف اس لئے "ھو الذی یمرضنی ویشفین" (۵) نہیں فرمایا بلکہ "واذا مرضت فھو یشفین" (۶) کہا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو حق تعالیٰ مجھ کو شفاء دے دیتے ہیں چونکہ بیماری طبعاً ناگوار ہے اس لئے ناگوارشی کو محبوب کی طرف منسوب نہیں کرتے اگرچہ حافظ یوں فرماتے ہیں

درد از یارست و درماں نیز ہم دل فدائے او شد و جاں نیز ہم (۷)

---

(۱) پکڑ ہوئی (۲) سیرت کی کتابوں میں ہے (۳) گناہ (۴) کھلانے پلانے اور شفا کو (۵) وہ مجھے بیمار کرتا ہے اور شفا دیتا ہے (۶) جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے (۷) درد بھی محبوب کی طرف سے ہے اور دوا بھی اسی کیطرف سے ہے دل اور جان اسی پر فدا ہیں۔

یہ درد اور درماں دونوں کو محبوب کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیمؑ حافظ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز ممکن ہے حضرت حافظ کے وار دوقت کا یہی مقتضاء (۱) ہو اور اصل میں مرض کو اپنی طرف منسوب کرنا زیادہ ادب ہے مگر ابراہیمؑ اس کے بعد یوں فرماتے ہیں۔

"والذی یمیتنی ثم یحیین" (۲) یہاں اماتت (۳) کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ موت ایسی ناگوار چیز نہیں جس کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہو گویا موت بیماری سے بھی کم ہے کہ وہ تو ناگوار ہے اور یہ ناگوار نہیں بلکہ موت تو مرغوب شئی (۴) ہے حدیث میں آتا ہے "الموت تحفۃ المؤمن" موت مؤمن کے لئے ایک تحفہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحفہ مرغوب (۵) ہی شئی ہوسکتی ہے نامرغوب (۶) کو تحفہ کوئی نہیں کہتا۔

اور جب ہر مؤمن کے لئے موت تحفہ ہے تو حضرت ابراہیمؑ کے لئے تو بالخصوص (۷) تحفہ ہے کیونکہ وہ تو سید المؤمنین ہیں ان کو موت کیونکر ناگوار ہوسکتی ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ گنہگار مسلمان کے لئے بھی موت تحفہ ہے گو کچھ دنوں کیلئے اس کو عذاب بھی بھگتنا پڑے کیونکہ موت ہی ذریعے سے اس کو کسی وقت خدا کا قرب حاصل ہوگا رہا یہ اشکال کہ کیا مقرب کو عذاب بھی ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں ہاں ہوتا ہے جیسے تم بادشاہ کے پاس کپڑوں میں گوبر لگا کر جاؤ تو وہ تم کو حمام میں بھیج دیں گے جہاں گرم پانی سے خوب مل دل کر تم کو غسل دیا جائے گا اسی طرح مسلمانوں کے لئے دوزخ جیل خانہ اور حوالات نہیں بلکہ مثل حمام کے ہے۔ دوسرے گنہگار مسلمانوں کو دوزخ کے عذاب کا بہت زیادہ احساس

---

(۱) حضرت حافظ کو پیش آمدہ کیفیت کا یہ تقاضا ہو (۲) وہی مجھ کو موت دیتے ہیں پھر زندہ کرتے ہیں (۳) مرنے کو (۴) جو پسندیدہ چیز ہے (۵) پسندیدہ (۶) ناپسندیدہ (۷) خاص طور پر۔

بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ حدیث مسلم میں ہے" یمیتھم اماتة" کہ حق تعالیٰ جہنم میں مسلمانوں کو ایک قسم کی موت دیدیں گے اور اگر عذاب بھی ہو تو قاعدہ یہ ہے جس نعمت کے زوال کی ہردم توقع ہو وہ اس نعمت سے افضل ہے جس کے زوال کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا ہو پس مسلمان کے لئے موت ہر حال میں اچھی ہے کیونکہ دنیا کی راحت میں زوال کا خطرہ لگا ہوا ہے اور آخرت کی تکلیف کے منقطع (۱) ہونے کی ہردم توقع ہے پس موت ناگوار چیز نہیں اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے یمیتنی ثم یحیین میں احیاء کی طرح امات (۲) کو بھی حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور ایوبؑ نے کلفت مرض کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا۔

"انی مسنی الشیطان بنصب و عذاب "(۳)

یہ تو نسبت الی الشیطان کا ایک نکتہ درمیان میں بتلا دیا۔

غایت محبوبیت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایوب علیہ السلام نے جس وقت یہ دیکھا کہ اب حق تعالیٰ دعا کو پسند کرتے ہیں اس وقت دعا کی اور جب تک اظہارِ صبر پسند تھا اس وقت تک صبر کیا اور دعا نہ کی تو یہ حضرات تجلیات وشیون الٰہیہ کو دیکھتے رہتے ہیں اور ان کے مقتضیات کے موافق عمل کرتے ہیں بلا تشبیہ (۴) یوں کہیے کہ یہ حضرات مزاج شناس ہوتے ہیں اسی طرح واقعۂ معراج میں جب تک حضور ﷺ نے یہ دیکھا کہ حق تعالیٰ کو مراجعت (۵) پسند ہے اس وقت تک حیاء سے مغلوب نہیں ہوئے اور مراجعت فرماتے رہے اور جب دوسری تجلی منکشف (۶) ہوئی تو حیاء غالب ہوگئی کیونکہ اس تجلی کا مقتضاء یہی تھا اب اس کے مناسب حالت غالب ہوگئی بہر حال اخیر میں آپ کا یہ فرمانا کہ اب مجھ کو حیا آتی ہے غلبۂ حال کا اثر

---

(۱) ختم ہونے کی (۲) زندگی کی طرح موت کو بھی (۳) سورۃ ص آیت ۴۱ (۴) بغیر تشبیہ (۵) واپس لوٹنا (۶) دوسری تجلی بھی ظاہر ہوئی۔

تھا اور یہی جواب دیا ہے حضرت استاد علیہ الرحمۃ نے تعدد رکوعات کا صلوۃ کسوف (۱) میں کہ اس وقت حضور ﷺ پر تجلیات کا غلبہ تھا آپ پر ایک تجلی غالب ہوتی جس کا مقتضاء طول قیام (۲) تھا کبھی دوسری تجلی غالب ہوتی جس کا مقتضا رکوع تھا رکوع سے فارغ ہو کر پھر وہ تجلی غالب ہوگئی جو قیام کو مقتضی تھی اس لئے پھر قیام فرمایا اس کے بعد پھر تجلی مقتضی رکوع کا غلبہ ہوگیا اسی غلبہ تجلیات میں آپؐ نے متعدد بار قیام اور متعدد رکوع کئے اور جو فعل شارع سے تشریعاً صادر نہ ہو بلکہ غلبۂ حال سے صادر ہو وہ مامور بہ نہ ہوگا۔ لہٰذا صلوۃ کسوف میں تعدد رکوعات مشروع نہیں (۳) جب آپؐ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمایا کہ اب میں کچھ نہیں کہتا اس وقت آواز آئی۔

"امضیت فریضتی وخففت عن عبادی وھی خمس وھن خمسون" (میں نے اپنے فرض کو نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف بھی کر دی پس فرض نمازیں پانچ ہیں اور یہ پانچ حقیقت میں پچاس ہی ہیں) کیا رحمت ہے کہ حضور خود ہی رُک گئے اس وقت فرمایا "امضیت فریضتی" اس سے پہلے نہ فرمایا اور نہ یہ بھی ممکن تھا کہ حق تعالیٰ پینتالیس کم ہونے کے بعد ہی خود فرما دیتے کہ بس اب اس سے زیادہ کمی نہیں ہوسکتی آئندہ درخواست نہ کی جاوے مگر حق تعالیٰ حضورؐ کی طبیعت پر ذرا بھی بوجھ نہیں ڈالتے جب خود آپؐ ہی معاملہ کو ختم کر چکے اس وقت فریضہ کو محکم کیا گیا سبحان اللہ کس درجہ محبوبیت ہے اور حق تعالیٰ کو آپ کی رضا کی کس قدر رعایت ہے۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا   من العنایة رکنا غیر منهدم (۴)

---

(۱) سورج گرہن کی نماز میں ایک روایت ہے کہ آپ نے ایک رکعت میں دو رکوع کیے (۲) اللہ کی ایک تجلی کا غلبہ ہوتا جس کا تقاضا یہ تھا کہ قیام لمبا کریں کبھی دوسری تجلی غالب ہوتی جو اس بات کی مقتضی ہوتی کہ رکوع لمبا کریں۔ (۳) سورج گرہن کی نماز میں اسی لئے دو رکوع شریعت میں مقرر نہیں ہوئے۔ (۴) اے مسلمانو! تمہیں مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی مہربانیوں اور عنایتوں کا ایسا ستون عطا فرمایا جو کبھی گرے گا نہیں۔

ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو ایسا محبوب نبی عطا فرمایا جس کے راضی کرنے کا حق تعالیٰ کو اس قدر اہتمام و رعایت ہے پھر آپ اُس وقت تک تھوڑا ہی راضی ہوں گے جب تک سب مسلمان جنت میں نہ پہنچ جائیں گے اس لئے ہم کو بہت کچھ امیدیں ہیں۔

نماند بعصیاں کسے در گرو　　که دارد چنیں سید پیش رو(۱)

چہ غم دیوار امت را کہ دارد چوں تو پشتی باں
چہ باک از موج بحر آنرا کہ باشد نوح کشتی باں(۲)

ازدیادِ ثواب

پھر اس کے بعد دوسری رحمت ہے اب پانچ کو پچاس کی برابر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے عام قانون ہوگیا۔ "من جآء بالحسنة فله عشر امثالها" (۳) کہ ایک نیکی دس نیکوں کے برابر ہے نماز کا حساب اس قانون پر موقوف نہیں تھا بلکہ میرا ذوق یہ ہے کہ یہ قانون خود واقعۂ صلوۃ سے مقرر ہوا۔ پھر تیسری رحمت یہ ہے کہ دس پر انحصار نہیں رکھا گیا بلکہ یہ تو کم از کم ہے اس سے زیادہ بھی ثواب ہوسکتا ہے چنانچہ ایک آیت میں ہے۔

"مثل الذين ينفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مأته حبة" (۴) اس سے معلوم ہوا کہ سات سو تک تضاعف ہوتا ہے مگر اس پر بھی حد نہیں اس کے بعد فرماتے ہیں۔ والله یضاعف لمن یشاء، کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے (یعنی سات سو سے) بھی زیادہ دیتے ہیں مگر یہاں یہ مضمون مصرح نہیں محتمل ہے مگر ایک حدیث میں یہ مضمون مصرح ہے حضورؐ فرماتے ہیں کہ

---

(۱) اپنے گناہوں کے سبب ایسا شخص کب جہنم میں رہ سکتا ہے جس کے رہبر آپؐ ہوں (۲) امت کی دیوار کو کیا غم ہوسکتا ہے جب اس کے سہارا آپؐ ہوں اسے طوفان موجوں سے کیا ڈر ہوسکتا ہے جس کے ناخدا حضرت نوح علیہ السلام ہوں (۳) جو ایک نیکی کریگا اس کو اس کا دس گنا ملیگا سورۃ الانعام آیت ۱۶۰ (۴) سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۱

حق تعالیٰ صدقہ کے چھوارہ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں جیسے وہ خود ہیں ویسا ہی ان کا ہاتھ ہے ان کی ذات ادراک عقول سے بالا ہے تو ان کے ہاتھ کی حقیقت کو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔

تو ندیدی گہے سلیماں را　　چہ شناسی زبان مرغاں را(۱)

اس لئے ہم کو ایسی باتوں میں گفتگو نہ کرنا چاہئے ہم کیا ہیں جو خدا کی صفات کو سمجھیں گے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد(۲)

پس ہم اس کی حقیقت بیان نہیں کر سکتے ہاں ہمارا اتنا عقیدہ ضرور ہے۔

لیس کمثله شئی کہ حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں اس لئے خدا کا ہاتھ ہمارے اور تمہارے ہاتھ جیسا نہیں ہے دیکھئے یہاں حق تعالیٰ نے لیس هو کمثل شئی (۳) نہیں فرمایا کیونکہ حق تعالیٰ تو قدیم ہیں ان میں یہ احتمال ہی نہیں ہوسکتا کہ ان کا وجود کسی شئی کے وجود کی مماثلت پر قائم ہوا ہو اس لئے لیس هو کمثل شئی کہنے کی ضرورت نہ تھی ہاں دوسری اشیاء حق تعالیٰ کے وجود سے متاخر ہیں(۴) ان میں یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ شاید ان میں سے کسی شئی کا وجود یا صفت اور ذات حق تعالیٰ کے وجود یا ذات وصفات کی مثل بنائے گئے ہوں اس کی نفی فرمادی گو مماثلت طرفین (۵) سے ہوتی ہے اور جب ایک طرف سے مماثلت کی نفی ہوگی تو جانب آخر سے بھی نفی ہوگی اس لئے لیس کمثله شئی کا مفہوم لیس هو کمثل شئی کے معنی کو بھی مستلزم ہے مگر پھر بھی جو صورت نفی تشبیہ کی قرآن میں ہے وہ اکمل ہے(۶) جس کا نکتہ میں نے بتلا دیا بہر حال حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں نہ وہ کسی کے مثل ہیں لہذا اتنا اعتقاد تو ضروری ہے کہ خدا کا ہاتھ کسی مخلوق کے

---

(۱) تو نے سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو تو جانوروں کی زبان کو کیا پہچانے گا۔ (۲) میری کیا مجال کہ میں باغباں سے پوچھوں کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا۔ (۳) وہ کسی چیز جیسا نہیں (۴) بعد میں ہیں (۵) اگرچہ مشابہت دونوں جانب سے ہوتی ہے (۶) قرآن نے مشابہت کی جس انداز میں نفی کی ہے وہ زیادہ کامل ہے۔

ہاتھ جیسا نہیں اور بعض صفات میں جو بظاہر مماثلت کا شبہ ہوتا ہے جیسے رحمت وعلم وغیرہ تو یہ اشتراک محض لفظی ہے(۱) حق تعالیٰ کی رحمت وعلم کی وہ حقیقت نہیں جو آپ کی رحمت وعلم کی حقیقت ہے چنانچہ ایک فرق پر تو علماء نے بھی متنبہ کیا ہے کہ حق تعالیٰ پر ان صفات کا اطلاق باعتبار غایات کے ہے باعتبار مبادی کے نہیں۔

پھر حق تعالیٰ اس چھوارہ کو پرورش فرماتے ہیں حتیٰ کہ وہ احد پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے اس حدیث سے میں یہ سمجھا ہوں کہ سات سو تک بھی حد نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تضاعف (۲) ہوتا ہے کیونکہ پہاڑ سے تمر (۳) کو وہ نسبت ہے کہ اس میں تو لاکھوں کروڑوں تمرات ہوں گے اسی کو فرماتے ہیں۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد	آنچہ در وہمت نیاید آں دہد
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را	کہ بیک گل می خری گلزار را (۴)

اور یہی خیال میر الیلۃ القدر کے متعلق ہے کہ وہاں جو الف شہر فرمایا ہے وہ الف تحدید (۵) کے لئے نہیں بلکہ تکثیر کثیر (۶) کے لئے ہے گو وہ فی الواقع خدا کے نزدیک ضرور محدود (۷) ہوگا کیونکہ "کل شئی عندہ بمقدار" (۸) منصوص ہے اور جب خدا کے نزدیک محدود ہے تو واقع میں بھی محدود ہی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے (بلکہ یوں کہئے کہ واقع خدا تعالیٰ کے علم کے مطابق ہے ۱۲) بس واقع میں تو ثواب لیلۃ القدر محدود ہے مگر یہاں تحدید (۹) مذکور نہیں اور اگر غیر محدود وغیر متناہی بمعنی " لا تقف

---

(۱) یہ صرف لفظا شرکت ہے (۲) اس سے بھی زیادہ بڑھ جائیگا (۳) کھجور (۴) آدمی جان لے کر سینکڑوں جانیں عطا فرماتے ہیں جس کی ہمت بھی نہیں وہ عطا کرتے ہیں وہ بازار کیسا ہے کہ ایک پھول کے عوض پورا گلستان عطا کرتے ہیں (۵) ایک ہزار کا عدد حد بیان کرنے کے لئے نہیں ہے (۶) بلکہ انتہائی زیادتی کو بیان کرنے کے لئے ہے (۷) عند اللہ اس کی حد ضرور ہوگی (۸) ہر چیز کی اللہ کے نزدیک ایک حد متعین ہے سورۃ الرعد آیت ۸ (۹) اس کی حد ذکر نہیں کی گئی۔

عند حد '' کہوتو یہ فی نفسہ ممکن ہے(۱) مگر لیلۃ القدر کے ثواب کا بایں معنی (۲) غیر متناہی ہونا محتاج دلیل ہے اور اس پر دلیل قائم ہونے کی ضرورت ہے جب دلیل نہیں تو اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا پس ظاہر بھی ہے کہ وہ واقع میں محدود بمعنی موقوف عند حد ہے مگر وہ حد ''الف'' (۳) نہیں اب یہ سوال رہا کہ جب ''الف'' کی تحدید نہیں تو ''الف شہر'' کیوں فرمایا اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ لغت عرب میں عدد کے لئے الف سے زیادہ کوئی لغت موضوع نہیں جیسے ہمارے ہاں ''مہاسنکھ'' (۴) سے آگے کوئی لفظ نہیں اس سے آگے کوئی شمار کرے تو ایک مہاسنکھ دو مہاسنکھ سو مہاسنکھ کہے گا کوئی اور لفظ بیان نہیں کرسکتا اسی طرح اہل عرب الف کے آگے جس عدد کو بیان کریں گے لفظ الف ہی کے ذریعے سے بیان کریں گے جیسے الف الف مائۃ وغیرہ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ الفاظ عدد کا منتہیٰ عرب میں الف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو عدد تمہارے نزدیک اعداد کی غایت اور منتہی ہے لیلۃ القدر اس سے بھی بڑھ کر ہے پھر لفظ خیر اسم تفضیل ہے معنی یہ ہوئے کہ بہت بڑھ کر سو اب تو اگر الف تحدید (۵) کے لئے بھی ہوتا تب بھی خیر عدم تحدید پر دال (۶) ہے خیر یہ تضاعف الی غیر المعدود تو قانونی طور پر نہیں بلکہ بطریق فضل ہے مگر دس گونہ ملنا تو قانون ہے جو کہ واقعہ صلوۃ میں مشروع ہوا۔

قربانی کا ثواب

تو میں کہتا ہوں کہ جیسے یہاں خدا تعالیٰ نے پچاس نمازوں کا بدل پانچ کو قرار دیا ہے اور وہ پچاس ہی کی برابر ہیں اسی طرح یہاں قربانی میں حق تعالیٰ نے ہماری جان کے بدلے جانور کی جان مانگی ہے اور اس کو جان کا بدل قرار دیا ہے تو اس میں بھی وہی ثواب ہوگا

(۱) اور اگر لامتناہی اس معنی کے اعتبار سے کہیں کہ وہ کسی حد پر رکتا نہیں تو درست ہے (۲) اس معنی کے اعتبار سے۔ (۳) ایک ہزار (۴) سو ارب کا ایک سنکھ اور سو سنکھ کا مہاسنکھ ہوتا ہے جو گنتی میں سب سے بڑا عدد ہے (۵) حد بیان کرنے کے لئے (۶) لفظ خیر سے اس کی حد نہ ہونے پر دلالت ہے۔

جو اپنی جان نذر کرنے میں ہوتا ہے پس اپنی جان دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر خوشی سے بھی دینا چاہے تو ممانعت ہے۔ لاتقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما۔(۱) اگر کہو کہ مقاتلہ میں تو جان دینے کا حکم ہے تو میں کہتا ہوں بالکل غلط بلکہ وہاں تو دوسروں کی جان لینے کا حکم ہے البتہ اس میں اس قدر ثبات (۲) کا امر ہے کہ اگر وہ تمہاری بھی جان لے لے تب بھی نہ بھاگو! غرض مقاتلہ میں قتل کرنے کا حکم ہے قتل ہونے کا حکم نہیں نہ یہ مقصود ہے اسی لئے جہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے مقتول ہونے کا ذکر فرمایا ہے وہاں پہلے "یقتلون" فرمایا ہے بعد میں "ویُقتلون" (۳) فرمایا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود تو قاتل بننا ہے تبعاً کبھی مقتول ہونے کی بھی نوبت آ جاتی ہے پس جان دینا کہیں بھی مقصود نہیں اور اگر کوئی خوشی سے بھی دینا چاہے تو منع کیا جائیگا اس میں راز یہ ہے کہ یہ جان ہماری ملک نہیں بلکہ خدا کی جان ہے اس میں ہم کو از خود تصرف کرنے کا کچھ حق نہیں اور اس بنا پر چاہئے تھا کہ نفس کا اضافت ہماری طرف نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف اس لئے منسوب نہیں کیا کہ اس صورت میں تم مچل جاتے اور کہتے واہ جان تو ہماری ہے اس واسطے فرمایا کہ ہاں بھائی ہاں جان تمہاری ہے مگر اپنی جان کو قتل نہ کرو! "ان اللہ کان بکم رحیماً" اللہ تعالیٰ کو تم پر رحم آتا ہے تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو حق تعالیٰ نے انسان کے ساتھ اکثر اس کے فہم کے موافق کلام فرمایا ہے یہاں بھی اسی کے موافق انفسکم فرما دیا ہے یہی کلام خود اس قابل ہے کہ اس پر جان دے دی جائے گو اس میں جان دینے کی ممانعت ہے مگر جان نکلنا اور ہے اور جان دینا اور ہے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام ایسا ہے کہ اس کو سن کر عشاق کی جان نکل جائے تو بجا ہے چنانچہ بعض آیات کو سن کر بعض عشاق کی جان

(۱) اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو اللہ تعالیٰ کو تم پر رحم آتا ہے سورۃ النساء آیت ۲۹ (۲) ثابت قدم رہنے کا حکم ہے (۳) پہلے یہ ذکر ہے کہ قتل کرتے ہیں پھر ذکر ہے کہ قتل ہوتے ہیں۔

نکل گئی اور اگر کسی نے خود جان دی ہے تو وہ پاگل یا مغلوب الحواس تھے ان کا فعل حجت نہیں گو وہ خود معذور ہوں ان کو اولیاء مستہلکین (۱) کہتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو کسی وجہ سے اپنے درجہ سے گر گئے اس لئے غم میں جان دیدی اور بعض وہ ہیں جو ترقی سے رہ گئے ایک ہی مقام پر اٹک گئے اور شطحیات (۲) اُن سے صادر ہونے لگیں جن کی وجہ سے لوگوں نے قتل کر دیا۔ منصور بھی اولیاء مستہلکین میں سے تھے حضرت غوث اعظم قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ منصور کی کسی نے مدد نہ کی اگر میں اس زمانہ میں ہوتا تو میں ان کو اس ورطہ سے نکال دیتا ہمارے حاجی صاحب نے بھی اپنے بعض معاصرین کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ ایک مقام پر اٹک گئے اگر میرے پاس آجائیں تو میں ان کو اس سے نکال دوں۔ واللہ حاجی صاحب بھی اپنے زمانہ میں عجیب چیز تھے آخر کوئی تو بات تھی جو تمام عالم اُن کے کمال کو تسلیم کئے ہوئے ہے۔ بہر حال جان دینا تو ممنوع ہے البتہ حق تعالیٰ نے تمہاری جان کے بدلے میں تم سے جانور کی جان مانگی ہے اور جب یہ اُس کا بدل ہے تو ان شاء اللہ اس میں بھی وہی ثواب ہوگا جو اپنی جان پیش کرنے میں ہوتا۔

اسرار کی تلاش

مگر یہ سب اسرار و حکم ہیں جو حجت نہیں ہیں مگر میں اپنا جی خوش کرنے کیلئے بیان کر رہا ہوں یہ اسرار نہ خود صاحب وارد (۳) کے لئے باعث قناعت ہوتے ہیں نہ اس کے متعلقین کے لئے مگر ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ خود تو اسرار کی تلاش میں کاوش (۴) نہ کرے اور جو بیساختہ کوئی بات قلب میں آجائے اور قواعد شرع کے خلاف نہ ہو تو اس کو بیان کر دے جس سے یہ نفع ہوتا ہے کہ حدیث میں ہے "انا عند ظن عبدی بی" (۵)

---

(۱) ہلاکت اختیار کرنے والے اولیاء (۲) سطحی باتیں (۳) جس پر یہ سر کھل جائے (۴) کوشش (۵) میں بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔

پس اگر کوئی شخص ان اسرار پر جزم نہ کرے بلکہ امید کے درجہ میں مثلاً اس کا معتقد ہو کہ ہم کو قربانی حیوان میں اپنی جان کی قربانی کا ثواب ملے گا تو اس گمان نیک کی بنا پر عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اس سے بھی معاملہ فرمائیں باقی از خود کاوش کر کے اسرار بیان کرنا مجھے پسند نہیں حافظ فرماتے ہیں۔

حدیث مطرب دمیگو درازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا(۱)

اس میں جستن کی ممانعت ہے مگر بنظر آمدن(۲) کی اجازت بھی ہے اور اصل میں عارف شیرازی رازِ دہر(۳) کی کاوش سے منع فرماتے ہیں یعنی امور تکوینیہ کی تلاش سے مگر اسرار حکم بھی اسی حکم میں ہیں۔ تلاش اور کاوش دونوں میں نہ چاہئے مگر گاہے گاہے(۴) ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے قدرے ذکر کی اجازت بھی ہے مثلاً کسی مصلحت سے مجذوبین سے کشف کی بات پوچھ لی جائے اور مصلحت کی حد یہ ہے کہ امور تکوینیہ میں ایک جانب تسلی حاصل کرنا چاہئے اس پر جزم واعتقاد(۵) نہ کرے تو اس کا مضائقہ نہیں حافظ نے ایک مقام پر اس اجازت کو بھی ایک توجیہ پر بیان فرمایا ہے کہتے ہیں۔

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس — کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را(۶)

لیکن جو اولیاء مسند رسول(۷) پر ہیں ان سے کشفیات اور تکوینیات کا سوال کرے کیونکہ حضور ﷺ کی عادت ایسے امور کے بیان کی نہ تھی گو حضورؐ سے پیش گوئیاں امور تکوینیہ کی بھی بہت ثابت ہیں مگر وہ آپؐ نے بضرورت از خود بیان فرمائی ہیں کسی کے پوچھنے پر نہیں فرمائیں

---

(۱) گویے کی بات سن اور زمانہ کے رازوں کے پیچھے کم پڑ کہ کسی نے عقلمندی سے اس راز کو فاش نہیں کیا (۲) تلاش کرنے کی ممانعت ہے لیکن جو خود بخود معلوم ہو اس کی اجازت ہے (۳) زمانے کے رازوں کی تلاش سے (۴) کبھی کبھی (۵) پختہ یقین (۶) تکوینی امور کے اندر چھپے رازوں کو اللہ کی محبت میں ڈوبے مجذوب سے پوچھو بلند مرتبہ صوفی کا یہ مقام نہیں (۷) جو اولیاء رسول اللہ کے طریق پر دعوت اور شاد میں مشغول ہیں ان سے کشف اور تکوینیات کے بارے میں سوال نہ کرے۔

بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی باتوں کا پوچھنا آپ کو ناگوار ہوتا تھا اسی لئے صحابہؓ بجز (۱) مسائل و احکام کے آپؐ سے کچھ نہ پوچھتے تھے۔ اسی طرح اولیاء وارثان رسول سے امور تکوینیہ کے متعلق سوال نہ کرنا چاہئے ہاں وہ از خود بیان کردیں تو سن لو۔ علی ہذا اسرار و حکم بھی اُن سے خود نہ پوچھنے چاہئیں ہاں اگر بے ساختہ ان کے قلوب پر اسرار کا ورود ہوگا تو وہ خود ہی بتلادیں گے۔

طریقہ ابراہیمی

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لن ینال اللہ لحومہا ولا دماء ھا ولکن ینالہ التقوی منکم(۲)

خدا کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کے پاس تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔ یہ تو ترجمہ ہوا اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس جگہ تقوی کے کیا معنی ہیں عام معنی تو تقوی کے یہ ہیں کہ سب اعمال شریعت کے مطابق ہوں اور اعمال میں تقرب الی اللہ (۳) کی نیت ہو یہ تو یہاں مراد ہیں ہی کیونکہ عام معنی کا تحقق ہر فرد میں ہوا کرتا ہے۔ مگر اس مقام پر تخصیص ذکر (۴) سے ذوقاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں تقوی سے مراد بہت ہی بڑا کامل تقوی ہے جس کو اس مقام سے خصوصیت ہے اور خصوصیت کی ضرورت اس لئے ہے کہ تقوی کا مفہوم عام (۵) تو تمام اعمال میں مشترک ہے پھر یہ ظاہر ہے کہ ہر عمل کو دوسرے عمل سے خاص امتیاز حاصل ہے۔ (جیسے حیوانیت انسان اور جملہ حیوانات میں مشترک ہے مگر امتیاز نوعی کی وجہ سے ہر حیوان کی حیوانیت برابر نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیوانیت کامل اور بعض کی ناقص ہے کسی میں مادہ حیات و حس و حرکت زیادہ ہے کسی

---

(۱) سوائے (۲) سورۃ الحج آیت ۳۷ (۳) اللہ کا قرب حاصل کرنے کی نیت (۴) خاص طور پر تقویٰ کے ذکر سے (۵) کہ سب اعمال شریعت کے حکم کے مطابق ہوں۔

میں کم ہے الغرض ہر نوع میں جو جنس ہے اس کو دوسری نوع کی جنس سے بھی خاص امتیاز ہوا کرتا ہے خواہ ماہیت کے اعتبار سے ہو خواہ آثار کے اعتبار سے کیونکہ ماہیات میں تشکیک کا ہونا نہ ہونا مختلف فیہ مسئلہ ہے ۱۲)

پس جیسے قربانی کو دوسرے اعمال سے خاص امتیاز ہے اسی طرح اس میں جو تقوی ہے وہ بھی خاص قسم کا تقوی ہونا چاہئے ۔ اب دیکھئے کہ وہ خاص قسم کا تقوی کیا ہے سو دوسری آیت میں حق تعالی فرماتے ہیں:

یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ☆(۱) میرے ذوق میں ” لا تموتن الا وانتم مسلمون “ حق تقاتہ کی تفسیر ہے ۔ مطلب یہ ہوا کہ کامل تقوی یہ ہے کہ اسلام پر موت ہو جائے اسلام کے معنی کیا ہیں اسلام کے معنی یہ ہیں کہ اپنے کو خدا تعالی کے سپرد کر دے یہ معنی دوسری آیت سے حاصل ہوتے ہیں ۔

ومن احسن دینا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن واتبع ملۃ ابراہیم حنیفا ☆ (۲)(اور اس شخص سے اچھا کس کا دین ہے جو اپنے آپ کو خدا تعالی کے سپرد کر دے اخلاص نیت کے ساتھ اور ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کا اتباع کرے جو خالص خدا کے ہو رہے تھے) ۔ جب اسلام کے معنی یہی ہیں تو تقوی کامل یہ ہوا کہ اپنی جان خدا تعالی کے سپرد کر دے کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا کہ خدا تعالی کے حکم سے ذبح ولد (۳) پر آمادہ ہو گئے تھے اور جو شخص ذبح ولد پر آمادہ ہو جائے وہ اپنی جان دینے پر تو ضرور آمادہ ہو گا کیونکہ بیٹے کا ذبح کرنا اپنے ذبح سے اشد ہے (۴) ۔ پس کامل تقوی یہ ہے کہ خدا کے واسطے جان دے دے یعنی جان کو اس کے سپرد

(۱) سورۃ آل عمران آیت ۱۰۲ (۲) سورۃ النساء آیت ۱۲۵ (۳) بیٹے کو ذبح کرنے پر (۴) سخت ہے

کر دے۔ جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسا کام کرے جس میں جان خرچ ہو جائے تیسری آیت میں اسکی اور زیادہ تصریح ہے فرماتے ہیں۔

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد۔(۱)

اور یہ آیت اتفاق سے آیات حج ہی سے مرتبط (۲) ہے۔ اور قربانی کو بھی حج سے تعلق ہے۔ اس لئے یہ دلیل بہت ہی واضح ہے۔ اور وہ ارتباط یہ ہے کہ اس موقع پر حق تعالیٰ نے حجاج کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ حج میں دعا کرنے والوں کی چند قسمیں ہیں اور گوان اقسام کا ذکر حج کیساتھ ہو رہا ہے مگر یہ تقسیم حجاج ہی کی ساتھ خاص نہیں بلکہ عام تقسیم ہے۔ جس کا تحقق موقع حج میں بھی ہو جاتا ہے پہلی قسم تو یہ ہے: ''فمنَ النّاس من یقول ربنا اتنا فی الدنیا وما لہ فی الآخرۃ من خلاق''☆(۳)

بعض لوگ تو وہ ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو جو کچھ ہو دنیا ہی میں دے دے اور ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں یہ فرد تو منکر آخرت ہے کیونکہ جو شخص آخرت کا قائل ہوگا وہ یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو سب کچھ دنیا ہی میں دے دے آخرت میں دینے کی ضرورت نہیں دوسری قسم یہ ہے جو یوں کہتے ہیں۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار(۴)

کہ اے رب ہم کو دنیا میں بھی حسنہ دے اور آخرت میں بھی حسنہ دے اور ہم کو عذاب نار (۵) سے بچا۔ افسوس ہے کہ بعض محرفین نے اس آیت میں حسنۂ اول کو انگریزی سے مفسر کیا ہے۔ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ حسنۃ کہتے ہیں اچھی حالت کو یعنی

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۷ (ترجمہ: اور بعض لوگ تو وہ ہیں جو اپنی ذات کو اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے بیچ دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے)(۲) ملی ہوئی (۳) سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۰ (۴) سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۱ (۵) آگ کا عذاب

خوشحالی کو۔ اور خوشحالی آجکل صرف انگریزی پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے وہی حسنۃ کا مصداق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ حسنۃ اس آیت میں دو جگہ آیا ہے وفی الاخرۃ کے ساتھ بھی حسنۃ ہے تو کیا آخرت میں بھی حسنۃ سے انگریزی ہی مراد لوگے؟ سو جنت میں تو انگریزی ہو نہیں سکتی کیونکہ حدیث میں تصریح (۱) ہے کہ جنت والوں کی زبان عربی ہوگی ہاں جہنم میں انگریزی ہو تو ممکن ہے جیسے ایک خانساماں کو کسی انگریز نے دھمکایا تھا کہ دور ہو چلے جاؤ اس نے کہا حضور کہاں جاؤں بولا جہنم (۲) میں جا، وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آکر کہنے لگا کہ حضور جہنم کے دروازہ پر تو صاحب لوگوں کا پہرہ ہے ہندوستانی کو جانے نہیں دیتے بلکہ یورپین ہونے کا سرٹیفکیٹ مانگتے ہیں تو شاید یہی مطلب ان لوگوں کا ہوگا کہ ہمیں بھی آخرت میں انگریزی والوں کا ساتھ نصیب ہو۔

صاحبو! یہ محض تحریف ہے بلکہ یہاں حسنہ سے مراد اعمال حسنہ ہیں اور دونوں جگہ بھی یہی معنی ہیں مگر ایک جگہ باعتبار صورت کے اور ایک جگہ باعتبار حقیقت کے کیونکہ نعمائے جنت (۳) کی حقیقت بھی اعمال حسنہ ہیں۔ اور اتنے فرق کا مضائقہ نہیں بلکہ کچھ فرق تو ضروری ہے کیونکہ نکرہ کے اعادہ میں مغائرت فی الجملہ لازم (۴) ہے چنانچہ حسنہ سے مراد اعمال حسنہ مراد لینے میں اور ایک جگہ صورت اعمال اور دوسری جگہ حقیقت اعمال سے تفسیر کرنے میں اتحاد کیساتھ مغائرت فی الجملہ (۵) بھی موجود ہے۔ دوسرے یہاں حسنہ سے دنیوی خوشحالی مراد لینا اس لئے بھی غلط ہے کہ آیت میں دنیا کو حسنہ کا ظرف بنایا گیا ہے اور ظرف ومظروف (۶) میں تغائر لازم ہے تو فی الدنیا حسنۃ کا لفظ چاہتا ہے کہ یہ

---

(۱) وضاحت ہے (۲) دوزخ (۳) جنت کی نعمتوں (۴) اسم نکرہ کو جب دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے تو پہلے اور دوسرے کے معنی میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے (۵) حقیقت اعمال سے دوسری جگہ تفسیر کرنے میں معنی میں اتحاد کے باوجود تھوڑا سا فرق ہو جاتا ہے جو تکرار کا مقتضی ہے (۶) ظرف اور مظروف ایک دوسرے سے الگ ہونے چاہئیں۔

حسنہ دنیا سے مغائر ہو ورنہ کلام کی تقدیر یہ ہوگی۔

ربنا اتنا فی الدنیا دنیا (۱) اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور دنیوی خوشحالی بھی دنیا ہی ہے۔ اوہ دنیا سے مغائر (۲) نہیں اس لئے یہ تفسیر صحیح نہیں ہوسکتی۔ پس انگریزی کو حسنہ کا مصداق بنانا بالکل غلط ہے یہاں تک دو قسمیں مذکور ہوئیں پہلی قسم کا مصداق تو کافر ہے۔ اور دوسری قسم کا مصداق عام مومنین ہیں اور چونکہ سباق (۳) کلام بتارہا کہ تقسیم موقع حج ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور عام آدمیوں میں بعض منافق بھی ہوں گے اس لئے تیسری قسم منافقین کی بھی ذکر کی گئی ہے۔

ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیوۃ الدنیا و یشھد اللہ علی ما فی قلبہ وھو الد الخصام☆ واذا تولیٰ سعیٰ فی الارض لیفسد فیھا و یھلک الحرث والنسل واللہ لا یحب الفساد☆ واذا قیل لہ اتق اللہ اخذتہ العزۃ بالاثم فحسبہ جھنم ولبئس المھاد(۴)

آگے چوتھی قسم بیان فرماتے ہیں جس کا مصداق مومن کامل ہے اور اس کو اس لئے الگ بیان فرمایا تاکہ پہلی صورت کو یعنی

من یقول ربنا اتنافی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ(۵)

کو کوئی مومن کامل کے ساتھ مخصوص نہ کرے پس حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ مومن کامل کو مستقل بیان فرمادیا چنانچہ ارشاد ہے

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد(۶)

اور بعض آدمی وہ ہے جو اپنی ذات کو اللہ کی رضا طلب کرنے کیلئے بیچ دیتا ہے اس

---

(۱) اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دنیا دے (۲) دنیا کے سوا نہیں (۳) کلام کا تسلسل بتارہا ہے (۴) سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۴ (۵) سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۱ (۶) سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۷

میں دو قول ہیں کہ شراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے یشری کو بمعنی یشتری کہا ہے یعنی و من الناس من یشتری نفسه من المهالك والمخادف (۱) اور یہ ایسا ہوگا جیسے بئسما اشتروا به انفسهم میں اشتراء نفس مذکور ہے اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو (اعمال صالحہ کر کے) اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے خرید لیتے ہیں یعنی بچا لیتے ہیں مگر اس تفسیر میں اتنا بعد کہ اشترا تو اس چیز کو ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے گو اس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز بھی قریب ہو تو بہتر ہے۔

اور گو بیع (۲) کے معنی مراد لینے میں بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے میں مجاز صرف یہ ہوگا کہ بیع میں طرفین (۳) سے مالیت ہوتی ہے۔ اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز ہوتی ہے کہ جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور اسکی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بعد نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے ضروری نہیں کہ بیع بائع (۴) کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ بیع بالتسلیم (۵) بھی ہو جاتی ہے دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ تسلیم کے لئے دوسرے کے قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو قادر کر دینا کافی ہے جس کو فقہاء تخلیہ سے تعبیر

---

(۱) ترجمہ اگلی سطر میں موجود ہے (۲) بیچنے (۳) دونوں جانب سے (۴) جس چیز کو بیچا جائے وہ بیچنے والے کے پاس نہ رہے (۵) جیسے سودا طے ہو گیا لیکن فروخت شدہ چیز ابھی سپرد نہیں کی۔

کرتے ہیں پس مومن کامل اپنی جان کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اس پر ہر طرح قادر ہیں اب یہ ان کی عنایت ہے کہ وہ بیع کو ہمارے ہی پاس امانت چھوڑ دیں ۔ غرض '' یشری نفسہ '' میں بیع کے معنی بعید نہیں ہیں البتہ مالیت کے اعتبار سے مجاز ضرور ماننا پڑے گا۔

ہاں ایک اشکال یہ ہوگا کہ جیسے اشتراء میں مشتریٰ وہ شئے ہوتی ہے جو پہلے سے پاس نہ ہو ایسے ہی مبیع وہ شئے ہوتی ہے جو پہلے سے مشتری کی ملک نہ ہو اور ہماری جان تو پہلے ہی سے حق تعالیٰ کی ملک ہے جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے مگر چونکہ ہم اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے زعم کے موافق بیع کا اطلاق صحیح ہے اور جو لوگ اپنی جان کو خدا کی ملک سمجھتے ہیں ان کو یہ علم کہ مخاطبین (۱) جان کو اپنی ملک سمجھتے ہیں بعد سماع (۲) لفظ بیع کے حاصل ہوا ہے پہلے حاصل نہیں ہوا ہے ۔ ابن عطاء کا قول ہے کہ ان اللہ اشتری من المومنین انفسهم واموالهم بان لهم الجنة (۳)۔ کو سن کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلہ میں ہماری جانیں خرید لی ہیں ہم کو اس کے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہمارے اندر دعویٰ ملکیت تھا جبھی تو اشتری فرمایا اس سے میرے جواب کی تائید ہوگئی کہ یہاں ہمارے مذاق کی رعایت کی گئی ہے۔

آیت کا شانِ نزول

پس راجح بھی ہے کہ یشری نفسہ میں بیع مراد ہے میں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ بعض وہ لوگ جو طلب رضا الٰہی کے لئے اپنی جان تک بیچ دیتے ہیں یہ تک میں نے اس لئے بڑھایا کہ شان نزول اس آیت کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو آ رہے تھے راستہ میں کفار نے گھیر لیا تو

(۱) جن سے خطاب کیا جا رہا ہے (۲) بیع کا لفظ سننے کے بعد (۳) سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۱

انہوں نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں کیسا تیرانداز ہوں (تیراندازی کے فن میں یہ بہت مشہور تھے) اگر مقابلہ کرو تو میں تیروں سے سب کو مار ڈالوں گا باقی اگر تم کو مال کی ضرورت ہو تو مکہ میں میرا بہت مال ہے لاؤ میں تم کو رقعہ لکھ دوں تم جا کر میرے وکیل سے مال لے لو۔ کفار نے اسی کو غنیمت سمجھا کیونکہ مقابلہ میں ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے رقعہ لکھ دیا اور وہ سب واپس چلے گئے۔ سو یہاں تو حضرت صہیب نے جان بچائی تھی اور جان بچانے کو مال دیا جان نہیں دی۔ سو شان نزول کو دیکھ کر معنی بیع پر اشکال ہوتا ہے کہ واقعہ نزول میں جان کی بیع کہاں ہوتی تھی بلکہ وہاں تو جان کو بچایا گیا تھا (اسی وجہ سے بعض مفسرین نے یشری نفسہ کی تفسیر یشتری نفسہ من المھالک والمخاوف کی ہے) مگر میں نے لفظ تک بڑھا کر اشکال کو رفع کیا ہے۔ کہ گو حضرت صہیب نے اس واقعہ میں بظاہر مال ہی دیا تھا مگر حقیقت میں وہ اپنی جان تک کو اللہ کی رضا کیلئے بیع کر چکے تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تنہا ہجرت کے لئے چل کھڑے ہوئے تھے۔ اور یہ وہی کر سکتا ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کر چکا ہو کیونکہ کفار کے نرغہ میں سے تن تنہا ہجرت کر کے نکلنا جان ہتھیلی پر رکھ کر چلنا ہے۔

پھر یہ تو ایک اتفاقی بات تھی کہ کفار مال لینے پر راضی ہو گئے اگر وہ مقابلہ پر آمادہ ہوتے تو حضرت صہیب اللہ کیلئے جان دینے پر بھی تیار تھے اور اس کیلئے تیار ہو کر نکلے تھے شاید کوئی یہ کہے کہ حضرت صہیب مقابلہ کرتے تو اقوی کمال تھا یا مال کو صدقہ کرتے تو یہ بھی ایک کمال تھا باقی جان بچانے کو مال دے دینا کیا کمال ہے۔ یہ تو ہر شخص کیا کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے تو جان بچاتے ہیں اپنی جان کی محبت سے اور حضرت صہیبؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے جان بچائی تھی جیسا کہ ابتغاء مرضاۃ اللہ(۱) سے معلوم ہو رہا ہے۔

---

(۱) اللہ کی رضا جوئی کے لئے

خالی نیت

اور یہ بات محض اتنی نیت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ میں اللہ کے واسطے جان بچاتا ہوں بلکہ غلبہ حال سے حاصل ہوتی ہے کہ یہ امر اس کا حال بن جائے کہ جان میری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی ہے جس کی حفاظت و خدمت میرے ذمہ ہے بدوں اس حال کے خالی نیت کی وہی مثال ہے جیسے ایک مولوی لٹھ مار نے ساڈھورہ کے ایک پیرزادے کو جبراً نماز کے لئے کھڑا کیا تھا جب اس کو نیت کا طریقہ بتلایا تو کہنے لگا کہ نیت کرتا ہوں چار رکعت نماز فرض کی اللہ کے واسطے ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر، وہ بیچارہ سچا آدمی تھا کہ اس نے اللہ کے واسطے کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور ہم لوگ اپنے دل کے روگ (۱) کو ظاہر نہیں کرتے ہم کام کرتے ہیں نفس کے ظلم سے اور کہتے یہ ہیں کہ اللہ کے واسطے کرتے ہیں صاحب جس پر یہ حال غالب ہوتا ہے وہ چھپتا (۲) نہیں ہے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ احکام الٰہیہ میں ذرا سستی نہیں کرتے خدا کے احکام میں سب سے زیادہ چست ہوتے ہیں۔

اور جب حق تعالیٰ حفاظتِ نفس کا حکم دیتے ہیں اس وقت وہ سب سے زیادہ اپنی حفاظت کرتے ہیں ان کو اپنی جان سے اس لئے محبت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جان ہے بلکہ اس لئے محبت ہے کہ یہ خدا کی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں طاعات کی توفیق ہوتی ہے۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

نازم بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است (۳)

---

(۱) مرض (۲) پیارا (۳) اپنی نظر پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھنے کا ذریعہ ہے اپنے پیروں پر قربان ہوں کہ تیرے کوچے میں پہنچانے کا ذریعہ ہیں اپنے ہاتھوں کو ہر وقت ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ تیرا دامن پکڑنے کا ذریعہ ہیں۔

بس حضرت صہیبؓ کا فعل ظاہر میں تو معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اس نیت وحال کی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا ہے ۔ ان کی نیت مقبول ہوگی اور آیت میں ان کی مدح کی گئی خواہ مال کہیں پہنچے جیسے کسی کے گھر میں آگ لگ گئی ہو تو گو اس کا مال جل گیا صدقہ میں نہیں گیا مگر ثواب تو ملا کیونکہ آیت

ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات (۱) میں آفات اضطرار یہ پر بھی ثواب کا وعدہ ہے جبکہ صبر کیا جائے۔

روح قربانی

بہر حال تقویٰ کامل کے معنی یہ ہیں کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے یہی اس جگہ مراد ہے اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں میرے نزدیک قربانی کی روح یہی ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں تمہاری قربانیوں کے لحوم ودماء (۲) حق تعالیٰ کے یہاں نہیں پہنچتے۔ بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے یعنی وہ دل کی حالت دیکھتے ہیں کہ قربانی کے وقت یہ اپنی جان کو بھی ہمارے سپرد کر چکا ہے یا نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں نیت ہی پہنچتی ہے صورت شئی نہیں پہنچتی اس سے محرم کی رسم شربت کا غلط ہونا بھی ثابت ہو گیا جو لوگ محرم میں شربت پلاتے ہیں وہ یوں سمجھتے ہیں کہ شربت کا ثواب شربت ہی کی صورت میں پہنچتا ہے اور چونکہ حضرات شہداء کربلاء پیاسے شہید ہوئے تھے اس لئے یہ لوگ شربت ہی کا تصدق کرتے ہیں تاکہ ان کو شربت پہنچ جائے سو اول تو یہی غلط ہے کہ شربت تصدق (۳) کرنے سے وہاں شربت ہی پہنچے گا دوسرے اس فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حضرات شہداء نعوذ

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۵ ترجمہ: البتہ ہم تم کو آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال وجان کی کمی سے
(۲) گوشت اور خون (۳) شربت کا صدقہ کرنے سے۔

باللہ اب تک پیاسے ہی ہیں۔ عوام میں اس کے متعلق ایک حکایت بھی مشہور ہے کہ خیر آباد کے ایک بزرگ تھے جن کے مرید نے زندہ پیر کی فاتحہ دلوائی تھی اور فاتحہ میں گرم گرم کھیر تقسیم کی تھی جب وہ پیر کے پاس آیا تو انہوں نے کہا میاں ذرا فاتحہ کے وقت گرم ٹھنڈا تو دیکھ لیا کرو تم نے گرم گرم کھیر دے دی جس سے میرے منہ میں چھالے پڑ گئے یہ حکایت کسی کی گھڑی ہوئی ہے ایسی ہی اختراع (۱) کی بناء پر عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ جو چیز صدقہ کی جائے مردہ کو وہی پہنچتی ہے حالانکہ نص (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں نیت اور تقویٰ پہنچتا ہے لحم ودم (۳) نہیں پہنچتا۔

حقیقتِ قربانی

تقویٰ کے جو معنی اس مقام پر میں نے بیان کئے ہیں یعنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کا دوسرا عنوان فنا ہے اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ حضرات صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا " ماھذہ الاضاحی یا رسول اللہ " کہ یہ قربانی کیا چیز ہے اہل علم جانتے ہیں کہ لفظ " مــا " سوال عن الحقیقۃ (۴) کیلئے موضوع ہے تو اس کلام میں صحابہؓ نے حقیقۃ اضحیہ سے سوال کیا تھا اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں " سنۃ ابیکم ابراھیم " سنت سے مراد طریقہ اور ان کا خاص مذاق ہے اب دیکھنا چاہئے کہ ابراہیمؑ کا فعل کیا تھا اگر دنبہ کا ذبح کرنا مراد لیا جائے تو یہ بعید ہے کیونکہ وہ ان کا فعل قصداً (۵) نہ تھا بلکہ بغیر قصد تھا ان کا اصل فعل تو وہی تھا جو قرآن میں مذکور ہے۔

" یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ☆ فَلَمَّا

(۱) گھڑی ہوئی باتوں کی وجہ سے (۲) قرآن وحدیث (۳) گوشت اور خون (۴) حقیقت دریافت کرنے کیلئے وضع کیا گیا ہے (۵) ارادۃً۔

أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ☆ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَّا إِبْرَاهِيمُ ☆ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ☆ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰؤُ الْمُبِينُ ☆ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ☆(۱)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصلی فعل ذبح ولد تھا اور دنبہ کا ذبح کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدل اور فدیہ تھا۔

ولد ذبیح کی تحقیق

باقی اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ وہ ولد ذبیح (۲) کون ہیں اسمٰعیل ہیں یا اسحٰق ہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح ہے جس کی ایک دلیل تو یہ ہیکہ ذبح ولد کا قصہ بیان فرما کر حق تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے وبشرناه باسحق نبیا من الصلحین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بشارت اسحاق سے مقدم ہے اس لئے وہ ذبیح نہیں ہو سکتے۔ دوسری لطیف دلیل یہ ہے کہ یقیناً جس ولد کو ذبح کیا گیا ہے بلوغ سے پہلے کیا گیا ہے کیونکہ نص میں یہ قید مذکور ہے فلما بلغ معه السعی کہ جب وہ لڑکا چلنے اور دوڑنے کی عمر کو پہنچ گیا اور یہ حالت بلوغ سے بہت پہلے ہو جاتی ہے۔

ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملائیے کہ اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کے ساتھ تو ان کا صاحب اولاد ہونا بھی بتلا دیا گیا تھا ومن وراء اسحق یعقوب (۳) اور وحی قطعی ہوتی ہے تو اب اگر ان کے ذبح کا امر ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کو عین ذبح کے وقت وحی سابق کی وجہ سے ان کی عدم موت کا پورا یقین ہوتا کہ یہ صاحب

(۱) سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۱۰۲، ۱۰۷ ترجمہ (۲) کس بچے کو ذبح کیا گیا تھا (۳) اور اسحٰق کے بعد ان سے یعقوب ہوں گے۔

اولاد ہونے سے پہلے کسی طرح نہیں مر سکتے پھر اس ذبح میں بلاغ مبین (۱) اور امتحان ہی کیا ہوتا اور اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق اس قسم کی کوئی بشارت نہ تھی کہ یہ صاحب اولاد ہوں گے اس لئے صحیح یہی ہے کہ ذبیح اسمٰعیل علیہ السلام ہیں بہر حال ابراہیم علیہ السلام کا فعل ذبح ولد تھا تو اب حضور کے جواب کا حاصل یہی ہوا کہ الاضحیة ذبح الولد یعنی قربانی کی حقیقت ذبح ولد ہے۔

سنت ابراہیمی کا مصداق

اور اگر لفظ سنت پر نظر کی جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ولد بھی حضرت ابراہیم کی سنت نہیں کیونکہ سنت اس فعل کو کہتے ہیں جس پر مواظبت اور دوام (۲) ہو اور ذبح ولد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی دفعہ کیا ہے پس سنت ابراہیم کا مصداق وہ فعل ہونا چاہئے جو ان کا دائمی طریقہ ہو اور وہ درحقیقت اسلام نفس ہے یعنی اپنے آپکو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کو فنا کہتے ہیں۔ یہی حضرت ابراہیم کا خاص مذاق اور دائمی طریقہ تھا۔ اذقال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین (۳)۔ اور ذبح ولد اس کی صورت تھی گو اسلام نفس کے مناسب صورت تو ظاہر میں یہ تھی کہ ان کو قتل نفس (۴) کا امر کیا جاتا مگر اس کے بجائے ذبح ولد کی صورت اس لئے اختیار کی گئی کہ یہ قتل نفس سے بھی اشد (۵) ہے چنانچہ ہر صاحب حس سمجھتا ہے خصوصاً جو کسی کا باپ بھی بن چکا ہو وہ جانتا ہے کہ باپ کو اپنی موت اور اپنی کلفت بیٹے کی موت اور کلفت سے سہل ہوتی ہے اولاد کی حفاظت کے لئے انسان ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے یہ تو اشدیت فی نفسہ ہے (۶)۔

---

(۱) بڑی آزمائش (۲) جو ہمیشہ کیا جائے (۳) سورۃ البقرۃ آیت ۱۳۱ ترجمہ: جب کہا اس کو اس کے رب نے کہ تعبدار ہو جا کہا میں نے تابعداری اختیار کی رب العالمین کی (۴) اپنی جان دینے کا حکم دیا جاتا (۵) اپنی جان دینے سے بھی مشکل ہے (۶) یہ تو ذات کے اعتبار سے سختی ہوئی۔

نیز اس وجہ سے بھی اشد ہے کہ اپنا قتل تو ایک ساعت (۱) کی کلفت ہے اور ذبح ولد عمر بھر کیلئے سانحہ جانکاہ (۲) ہے کسی کا بچہ اس کے ہاتھ سے ذبح ہو جائے تو عمر بھر اس کے دل پر آرے چلیں گے اس لئے اسلام نفس کی یہ صورت اختیار کی گئی ہے۔

اب یہ اشکال ہوگا کہ قربانی تو جانور کی ہوتی ہے نہ کہ ولد کی پھر یہ سنت ابراہیم کیونکر ہوئی جواب اس کا پہلے کالم سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ حق تعالی نے اپنی عنایت سے تمہاری جان کا عوض حیوان کی جان کو بنایا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی نفس اسمٰعیل کا جو حکما عین نفس ابراہم تھے فدیہ ذبح کبش (۳) کو قرار دیا گیا تھا اور اجر میں وہ ذبح ولد کے برابر تھا اسی طرح جانور کی قربانی بھی ثواب میں اپنی جان دینے کے برابر ہے اور بھی بذل نفس (۴) قربانی کی روح ہے جس کے واسطے میں نے یہ شعر پڑھا تھا۔

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جانِ مضطر — کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا (۵)

تو حق تعالی کی یہ کتنی بڑی رحمت وعنایت ہے کہ چند روپے خرچ کرنے میں اتنا بڑا اجر دیتے ہیں۔

جانور کا انتخاب

مگر جب قربانی کا جانور آپکی جان کا عوض ہے تو اس کو کچھ تو ایسا ہونا چاہئے کہ محبوب اور پیارا ہو اب جو لوگ سڑیل سے سڑیل اور گھٹیا سے گھٹیا جانور خریدنے کی فکر کرتے ہیں یہ زیبا نہیں لیکن اگر عمدہ مال ہو اور سستا مل جائے تو اس کا مضائقہ نہیں یہ تو عاجل بشری المومن (۶) اور غنیمت بارد ہے ہم خرما و ہم ثواب (۷)۔ لیکن بعض لوگ تو چھانٹ

---

(۱) ایک لمحہ کی پریشانی (۲) ایک جان لیوا غم (۳) دنبہ کے ذبح کو فدیہ کہا (۴) اپنی جان خرچ کرنا (۵) جب محبوب کے کوچہ میں پہنچ جاؤ تو اپنی جان بیقرار دے دو کہ شاید دوبارہ اس تمنا کے پورا ہونے کا موقع نہ آئے (۶) یہ تو مسلمان کی نقد خوشی ہے (۷) فائدے کا فائدہ اور ثواب کا ثواب۔

کر خراب جانور خریدتے ہیں سو اس کی ممانعت ہے جیسا کانپور میں ایک شخص نے بکرا قربانی کیا تھا جس میں سارے عیوب تھے مگر ہر عیب تہائی سے کم تھا حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔

ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باخذیه(۱)

اسمیں تیمم اور قصد کی ممانعت ہے کہ اللہ تعالیٰ کیواسطے چھانٹ کر بری چیز کا قصد نہ کرو تیمم کی قید میں بھی رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ بعض لوگ غریب بھی ہوں گے جن کے پاس گھٹیا ہی مال ہوگا تو اگر وہ گھٹیا دیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ وہ گھٹیا کا انتخاب اور قصد (۲) نہیں کرتے کہ ان کے پاس ہے نہیں پھر آگے اس کا معیار بتلاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہر شخص کے اعتبار سے گھٹیا کا درجہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ولستم باخذیه (۳) یعنی بس یہ دیکھ لو کہ اگر ایسی چیز کوئی تم کو دے تو تم بھی خوشی سے اس کو لے سکتے ہو لحاظ کا لینا معتبر نہیں اسلئے آگے الا ان تغمضوا فیه (۴) بھی بڑھا دیا پس جو چیز تم دوسرے سے خوشی کے ساتھ لے سکتے ہو اس کو اللہ کے نام پر بھی دے سکتے ہو اور ظاہر ہے کہ جس غریب کے پاس سب گھٹیا ہی مال ہے وہ دوسرے سے بھی اس جیسی چیز لے سکتا ہے لہٰذا ان کو گھٹیا جانور کی قربانی جائز ہے اور جو لوگ ایسے نازک ہیں کہ بیمار اور دبلے جانور کا گوشت کبھی نہیں لیتے ہمیشہ عمدہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں اگر یہ دبلا پتلا جانور قربانی کریں گے تو اس کی ممانعت ہوگی کیا رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے معیار بھی خود ہی بتلا دیا تمہاری رائے پر نہیں چھوڑا۔

آگے فرماتے ہیں واللہ غنی یعنی خدا تعالیٰ غنی ہے اس کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں بس خدا کے نام پر ایسا مال دو جیسا اغنیاء کو دیا کرتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۷ ترجمہ: ایسی بری چیز صدقہ کرنے کا ارادہ نہ کرو کہ جس کو تم خود لینا پسند نہ کرو (۲) ارادہ (۳) اور تم اس کے لینے والے نہیں (۴) مگر یہ کہ چشم پوشی کرو۔

کہ جب خدا تعالی کو احتیاج نہیں تو پھر ہم جیسا چاہیں خرچ کریں تو فرماتے ہیں حمید یعنی گو ان کو احتیاج نہیں مگر کرتے تو ان کی رضا کیلئے ہو جب یہ ہے تو وہ محمود بھی ہیں اس لئے ان کے نام پر ہر حال میں محمود ہی خرچ کرنا چاہئے پھر بعض کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تو سب کچھ ہے کہ اللہ کے لئے مال محمود خرچ کرنا چاہئے کیونکہ وہ غنی حمید ہے مگر عمدہ مال میں روپے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں پھر محتاج ہو جاویں گے اس کا جواب دیتے ہیں الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء کہ یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ وہ تم کو فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کی بات بتلاتا ہے فحشاء سے مراد یہاں مفسرین کے نزدیک بخل ہے واقعی یہ کیسی بے حیائی کی بات ہے کہ خدا ہی کا مال اس کے حکم سے بھی نہیں دینا چاہتے۔

آگے زیادہ ہمت بڑھاتے ہیں۔

واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا اور اللہ تعالی تم سے (انفاق پر) مغفرت کا وعدہ کرتے ہیں اور ترقی (مال و دولت) کی امید دلاتے ہیں پس مطمئن رہ کہ صدقہ خیرات سے مال میں کمی نہ آئیگی۔ بلکہ ترقی ہوگی (حدیث میں اس کی زیادہ تصریح ہے رسول ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا ۱۲) آگے واللہ واسع علیم بھی ایک اشکال کا جواب ہے کہ حق تعالی بڑے وسعت والے ہیں ان کے یہاں کچھ کمی نہیں اس لئے وعدہ فضل پر شبہ نہ کرو اور وہ ہر شخص کے عمل کو خوب جانتے ہیں اس لئے یہ وسوسہ نہ کرو کہ اتنے آدمیوں میں ہمارے عمل کی کیا خبر ہوگی ان سے ذرہ برابر کسی کا عمل مخفی نہیں فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ آگے توفیق پر حوالہ کرتے ہیں۔

یوتی الحکمۃ من یشاء و من یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا وما یذکر الا اولو الالباب(۱)

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹

یعنی حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں فہم دیتے ہیں اور جس کو فہم عطا ہو گئی اس کو خیر کثیر مل گئی اور عقل والے ہی بات کو سمجھتے ہیں اس میں ان لوگوں کو متنبہ فرما دیا۔ جو اعمال صالحہ کر رہے ہیں کہ وہ اس پر ناز نہ کریں اعجاب وتکبر(۱) اختیار نہ کریں یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے جو تم کو دین کی سمجھداری اور اعمال صالحہ کی توفیق عطاء فرمائی بہر حال فقر کا اندیشہ نہ کرو اور خدا کے نام پر جہاں تک ہو سکے عمدہ جانور ذبح کرو۔ جس کو ذبح کر کے کچھ تو دل دکھے جیسا کہ اپنی جان کو پیش کرتے یا بیٹے کو ذبح کرتے تو دل دکھتا اب ویسا تو کہاں دل دکھے گا لیکن کچھ تو مال ایسا ہو جس کو ذبح کرتے دل پر کچھ چوٹ لگے حق تعالیٰ فرماتے

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون(۲)

مراد 'بر' کامل(۳) ہے کہ 'بر' کامل تم کو اس وقت تک حاصل نہ ہو گی جب تک کہ محبوب اشیاء نہ خرچ کرو۔ وما تنفقوا من شئی فان اللہ بہ علیم میرے نزدیک اس آیت میں من شئی مما تحبون کا بیان نہیں بلکہ اس کا مقابل ہے اور مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو محبوب شے کے انفاق سے حاصل ہو گا اور یوں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے کچھ نہ کچھ ثواب مل ہی جاوے گا انفاق محبوب کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار قربانی کی تھی۔ آپ نے قربانی سے کئی مہینے پہلے ایک گائے خریدی تھی اور اس کو خوب دانہ کھلایا پلایا اور عصر کے بعد جنگل میں اپنے ساتھ لے جا کر دوڑایا کرتے تھے قربانی کے وقت تک وہ اتنی تیار ہو گئی کہ اس ارزانی(۴) کے زمانہ میں بھی قصائی اس کی قیمت اسی روپے دے رہے تھے آجکل گرانی کے زمانہ میں تو نہ معلوم کتنی قیمت ہوتی مگر مولانا نے کسی کو نہ دی اور قربانی کے دن ذبح کیا جب وہ ذبح ہوئی تو مولانا کے دل پر اثر ہوا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ عرصہ تک ساتھ

(۱) ناز وتکبر (۲) سورۃ آل عمران آیت ۹۲ (۳) کامل نیکی (۴) سستے زمانہ میں۔

رکھنے اور پرورش کرنے سے اس کے ساتھ محبت ہوگئی تھی اس پر کوئی یہ نہ کہے کہ رنج کے ساتھ ذبح کرنا تو اچھا نہیں بلکہ خوشی کیساتھ ذبح کرنا چاہئے کیونکہ حضرت فاطمہؓ سے رسول ﷺ نے فرمایا

یا فاطمة احضری اضحیتك وطیبی بها نفسك(۱)

لہذا ایسا جانور ذبح کرنا چاہئے جس کے ذبح سے خوشی ہو کہ اچھا ہوا پاپ کٹا سو یہ خیال غلط ہے کہ حدیث میں طیب نفس (۲) کا امر ہے وہ خوشی عقلی ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں کہ ایسا جانور ذبح کرے جس سے دل دکھے۔ یہ رنج طبعی ہے جو عقلی خوشی کے منافی (۳) نہیں۔

مشاہدہ کے بعد نذرانہ

غرض قربانی کا زمانہ بعد حج کا ہے اور حج کی روح مشاہدہ ہے اور مشاہدہ کے بعد نذرانہ دیا کرتے ہیں تو یہ قربانی نذرانہ ہے اب قاعدہ ہے کہ سلاطین نذرانہ کو رکھا نہیں کرتے بلکہ اس پر ہاتھ دھر کر واپس کر دیتے ہیں یہاں بھی یہ معاملہ ہے چنانچہ گوشت تو فورا ہی دے دیا گیا کہ کھاؤ اور کھلاؤ اور غریبوں کو دو دوستوں کو دو یا سارا اپنے خرچ میں لے آؤ سب جائز ہے پہلی امتوں کو قربانی کا گوشت کھانا جائز نہ تھا بلکہ ذبح کر کے پہاڑ پر رکھ دیتے تھے غیب سے ایک آگ جلا دیتی تھی۔ یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ اس کو قربانی کا گوشت واپس کر دیا گیا کہ جو چاہو کرو اور دوسری واپسی یہ ہے جس کا دوسری آیت میں ذکر ہے۔

وما انفقتم من شئی فهو یخلفه وهو خیر الرازقین(۳)

کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو حق تعالیٰ اسکی جگہ اس کا عوض عطا کر دیتے ہیں اور وہ سب دینے والوں میں بہتر ہیں تو جو عوض دیں گے وہ اصل سے بہتر ہوگا پس قربانی میں

---

(۱) اے فاطمہ اپنی قربانی کے سامنے موجود رہو اور اپنا دل خوش رکھو (۲) عقلی خوشی کے خلاف نہیں (۳) سورۃ سبا آیت ۳۹

صورۃً تو آپ جانور کی جان پیش کرتے ہیں اور حقیقۃً اپنی جان پیش کرتے ہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا کہ اس کی حقیقت اسلام نفس (۱) ہے وہاں سے اس کے بدلہ میں آپ کو دوسری جان ملتی ہے۔ جو اس سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جس کی حقیقت دو مثالوں سے سمجھئے۔

ایک تو آصف الدولہ کی حکایت ہے کہ اس نے بڑھیا کی سل کو سونا بنادیا تھا واقعہ یہ ہے کہ آصف الدولہ نے ایک بڑھیا کو دیکھا کہ اصطبل میں ایک سل لئے ہوئے گھوڑے کے سُم (۲) سے رگڑ رہی تھی پوچھا مائی کیا کرتی کہا کہ بیٹا میں نے سنا ہے کہ آصف الدولہ کے گھوڑے کا سم اگر پتھر پر پڑ جائے تو وہ سونا ہو جاتا ہے کہنے لگا سچ مگر تم کو رگڑنا نہیں آتا تم سل چھوڑ جاؤ میں سونا بنادوں گا وہ چھوڑ کر چلی گئی حکم دیا کہ اس سل کی برابر ایک سونے کی سل بنوا کر رکھ دو جب وہ بڑھیا آئی اس کو حوالہ کردی لو تمہاری سل سونے کی بن گئی۔

اور دوسرا قصہ مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ ایک دیہاتی بہت غریب تھا جس پر فاقے گزرتے تھے اس کے گاؤں میں شدید قحط ہوا کہ کنویں اور تالاب خشک ہو گئے اس کی بیوی نے کہا کہ خلیفہ بغداد سنا ہے بہت کریم ہے تم اس کے پاس جاؤ شاید تمہارا فقر و فاقہ زائل (۳) ہو جائے اس نے کہا کہ خلیفہ کے پاس جانے کیلئے کوئی ہدیہ اور نذرانہ بھی تو ہونا چاہئے خالی ہاتھ کیونکر چلا جاؤں اور میرے پاس اس کے لائق ہدیہ کہاں ہے بیوی نے کہا ہمارے فلاں گڑھے میں جو صاف و شفاف کچھ پانی مجتمع (۴) ہے ایسا پانی خلیفہ نے کہاں دیکھا ہوگا تم یہ پانی ایک گھڑے میں بھر کر لے جاؤ یہ رائے مرد کی بھی سمجھ میں آگئی چنانچہ گھڑا بھر کر لے چلا اور عورت نے مصلی بچھا کر اس پانی کے صحیح سالم پہنچنے کیلئے دعا کرنی شروع کی اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

---

(۱) نفس کو سپرد کرنا (۲) گھوڑے کے پاؤں میں لگے لوہے سے رگڑ رہی تھی (۳) دور ہو جائے (۴) جمع ہے۔

زن مصلّی باز کردہ از نیاز رب سلم ورد کردہ در نماز (۱)

ادھر وہ تمام راستے 'رب سلم رب سلم' کا ورد (۲) کرتا ہوا چلا کہ الٰہی اس گھڑے کی خیر رہے اور میرے قدموں کی بھی خیر رہے کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے کیونکہ اس بیچارہ کے پاس تو سب کچھ یہی تھا میں کہتا ہوں اسی طرح انبیاء علیہم السلام پل صراط پر اپنی اپنی امتوں کے لئے رب سلم رب سلم (۳) کے ساتھ دعا فرمائیں گے کہ الٰہی مسلمانوں کے قدموں کو لغزش سے بچائیں کہیں جہنم میں نہ گر جائیں۔ پھر خدا خدا کر کے سلامتی کیساتھ وہ گھڑا بغداد پہنچا۔ اور دربار میں اطلاع واذن (۴) کے بعد حاضر کیا گیا خلیفہ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے بدوی (۵) کہتا ہے ھذا ماء الجنۃ یہ جنت کا پانی ہے ایسا پانی کسی نے کبھی نہ پیا ہوگا۔ خلیفہ نے گھڑے کے کھولنے کا حکم دیا چونکہ عرصہ کا بند کیا ہوا تھا اسلئے کھولتے ہی دربار سڑ گیا۔

صاحبو! یہی حالت ہمارے اعمال کی ہے کہ وہ حقیقت میں سڑے ہوئے ہیں مگر خلیفہ کا کرم دیکھئے کہ اس نے ذرا بھی کسی انداز سے بدوی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم کو اس کی بدبو سے ایذا (۶) ہوئی ہے۔ بلکہ کمال یہ کیا کہ سر دربار (۷) اس میں سے ایک گلاس بھروا کر چکھا اور بہت تعریف کی کہ نہایت نفیس ولطیف پانی ہے اس کو خاص اہتمام سے فلاں جگہ رکھا جائے چنانچہ اس وقت تو اٹھوا کر کسی جگہ رکھ دیا اور بعد میں اس کے غیبت (۸) میں گرا دیا گیا یہی معاملہ بلاتشبیہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہمارے اعمال تو سڑے ہوئے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کی قدر فرماتے ہیں۔

---

(۱) عورت جائے نماز بچھا کر نماز میں رب سلم کا وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئی کہ یہ گھڑا صحیح سلامت پہنچ جائے (۲) یا اللہ یہ گھڑا صحیح سلامت پہنچ جائے یہ وظیفہ پڑھتا ہوا جا رہا تھا (۳) اے رب حفاظت کرنا (۴) اجازت (۵) دیہاتی (۶) تکلیف (۷) بھرے دربار میں (۸) اس دیہاتی کی عدم موجودگی میں۔

پھر خلیفہ نے حکم دیا کہ اس بدو کا گھڑا سونے کی اشرفیوں سے بھر کر واپس کیا جائے اور خدام سے کہا کہ اس کو دجلہ (۱) کے راستہ سے لے جانا تاکہ تکان دور ہو جائے اور فرحت ہو نیز اس کو اپنے ہدیہ کی حقیقت اور ہمارے کرم کی عظمت کا مشاہدہ ہو جائے چنانچہ جب وہ دجلہ پر پہنچا ہے اور اس کی لطافت و شیرینی کو دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ اللہ اللہ یہ خلیفہ کیسا کریم ہے اس کو میرے گدلے اور متعفن پانی کی کیا ضرورت تھی جس کے شہر میں ایسی صاف و شفاف و شیریں نہریں چل رہی ہو اور اب معلوم ہوا کہ خلیفہ نے اس کے ہدیہ کی جو کچھ تعریف کی تھی وہ محض اس کی دلجوئی (۲) تھی۔

صوفیہ کی کمائی

صاحبو! یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے کہ ہمارے حسنات (۳) حقیقت میں سیئات (۴) ہیں مگر حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ ان کو طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں اور ہم کو مطیعین (۵) میں داخل کر لیتے ہیں یہ ہے یبدل اللہ سیأتہم حسنات (۶) اور جیسے خلیفہ نے سڑے ہوئے پانی کے بدلہ میں اشرفیاں دی تھیں۔

ایسے ہی یہاں تم جو اپنی جان پیش کرتے ہو سڑی ہوئی ہے کیونکہ صفات رذیلہ سے متصف (۷) ہے اور حق تعالیٰ اس کے عوض تم کو ایسی جان عطا فرماتے ہیں جو لطیف و شفیف ہے کیونکہ وہ اب متصف بصفات اللہ ہو جاتی ہے اسی کا نام فنا و بقاء ہے یہی صوفیہ کی تحصیل ہے کہ اول وہ اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں تو یہ تو فنا ہے اور اس وقت وہ جان صفات رذیلہ سے متصف تھی پھر حق تعالیٰ اس کو اپنی صفات سے متصف کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ یہ بقاء ہے اور گو اس وقت بھی وہ جان حقیقت میں پہلی ہی جان

(۱) دریائے دجلہ بغداد کا مشہور دریا ہے (۲) دلداری (۳) نیکیاں (۴) برائیاں (۵) اطاعت گذاروں میں (۶) یہ ہے کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے (۷) بری صفات سے ملے ہوئے ہیں۔

ہوتی ہے مگر اس وقت کی اور پہلی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کیمیاوی طریقہ سے تانبہ کو سونا بنا دیا جائے تو گویا مادہ وہ ہی ہے جو پہلے تھا مگر اس کی صورت اور حالت اور خاصیت اس درجہ بدل گئی ہے کہ اس کو وہی کہنا دشوار ہے بلکہ اب دوسری شے ہوگئی ہے مولانا فرماتے ہیں۔

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی　　گرچہ جوئے خوں بود نیلش کنی(۱)

اسی طرح یہاں فناء کے بعد تمہاری روح کی حالت ایسی بدل جاتی ہے کہ گویا دوسری روح ہے اب یہ اس کا مصداق ہوجاتی ہے کہ بی یسمع و بی یبصر و بی ینطق و بی یبطش و بی یمشی اس کا چلنا پھرنا بولنا سنا سب خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے اپنی رائے سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ خود کو تو فنا کر چکا ہے یہی ہے روح قربانی کی کہ اول تم اپنی جان پیش کرتے پھر ادھر سے دوسری جان عطا ہوتی ہے گویا روح قربانی فنا و بقاء فنا اپنا فعل ہے اور بقا حق تعالیٰ کا عطیہ ہے۔

اور یہ معلوم ہے کہ فنا و بقاء کتنی بڑی نعمت ہے کہ صوفیہ کی ساری کمائی یہی ہے تو اس سے قربانی کی عظمت بھی معلوم ہوگئی۔ اور کچھ قربانی ہی کی نہیں بلکہ تمام اعمال کی روح یہی فنا و بقا ہے ہر عمل میں اول حق تعالیٰ کے حکم سے بندہ اپنی جان کو پیش کرتا ہے پھر وہ اس کے بدلہ میں دوسری جان خود عطاء فرماتے ہیں اب جیسی فنا ہوگی ویسی ہی بقا ہوگی اگر فنا کامل ہے بقا بھی کامل ہے ورنہ اس کے مناسب بقا ہوگی۔

مگر یہ نسبت اور اعمال کے اس فنا و بقاء کے ظہور قربانی میں زیادہ ہے اسلئے میں نے قربانی کیساتھ اس روح کو بیان کیا ہے ورنہ فنا و بقا خود مقصود ہے خواہ قربانی کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے ہو پس یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قربانی کا وقت نکل جانے کے بعد پھر فنا

---

(۱) اہل اللہ اپنی کیمیاگری سے اتنی تبدیلی کرتے ہیں کہ اگر خون کی ندی ہو تو اسے بھی دریائے نیل بنا دیتے ہیں۔

وبقا کا حصول نہیں ہوسکتا۔نہیں ہر زمانہ میں ہر عمل کے ساتھ اس کا حصول ہوسکتا ہے۔پس اس کا اہتمام کرنا چاہئے اب ترتیب اس تربیت کی یہ ہونی چاہئے کہ اول کسی کامل کے پاس رہ کر مجاہدہ میں مشغول ہو پھر مشاہدہ نصیب ہوگا پھر فنا وبقا حاصل ہوگا۔

حقیقت وصول

اور تم یہ مت سمجھنا کہ ہم اس قابل کہاں۔ارے حق تعالی بڑے کریم وجواد ہیں تم ایک دفعہ طلب میں مشغول تو ہو انشاء اللہ وصول بھی ہوجائے گا۔وہ اپنے طالب کو محروم نہیں کیا کرتے۔خود ارشاد فرماتے ہیں من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا ومن اتانی یمشی اتیته هرولة(۱)

یہ انکی عنایت ہے کہ جب تم چلنا شروع کرتے ہو تو وہ خود تم سے زیادہ قریب ہوکر مسافت کو کم کردیتے ہیں ورنہ انسان سے یہ راستہ کیونکر طے ہو یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں وصول انسان کے چلنے سے نہیں ہوتا بلکہ حق تعالی خود آکر اس سے مل جاتے ہیں۔تو دراصل واصل وہ ہیں۔یہ واصل نہیں ہے مگر یہ بھی ان کی رحمت ہے کہ وہ طالب کو واصل کا لقب دیتے ہیں۔

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند(۲)

اسی طرح یہ غایت کرم ہیکہ وہ تم کو اپنا محب فرماتے ہیں۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ(۳)

---

(۱) جو میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں

(۲) دراصل مشک کی خوشبو اے محبوب تیری زلفوں سے پیدا ہوتی ہے لیکن ہم نے مصلحت کے سبب اسکا ذریعہ ہرن کا ناف قرار دیدیا (۳) سورۃ آیت ترجمہ: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو پس میرا اتباع کرو اللہ تم کو محبوب بنالیں گے۔

حالانکہ حقیقت میں محب حق تعالیٰ ہیں کیونکہ محبت معرفت سے ہوتی ہے سو حق تعالیٰ کو تو ہماری معرفت ہے ہم کو ان کی معرفت کہاں پس ہماری محبت جو کہ بلا معرفت ہے محض برائے نام محبت ہے ورنہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کو ہم سے محبت ہے مگر کس درجہ عنایت ہے کہ وہ ہم کو اپنا محب فرماتے ہیں واللہ بات بات میں ان کی رحمت ہے کس کس بات پر جان فدا کی جائے اسی کو مولانا فرماتے ہیں

ہر کہ عاشق دیدیس معشوق داں کو بہ نسبت ہست ہم ایں وہم آں

یعنی یہ مت سمجھو کہ تم ہی عاشق ہو بلکہ دراصل حق تعالیٰ تم کو چاہتے ہیں ان کے چاہنے کے بعد تم نے ان کو چاہا ہے مگر دونوں میں فرق اتنا ہے کہ:

میل معشوقاں نہاں ست ستیر عشق عاشق با دو صد طبل ونفیر

انکی محبت مخفی ہے جس میں جوش وخروش نہیں کیونکہ وہ اضطرار سے پاک ہیں اور تمہارے عشق نے اودھم مچادیا اور فرماتے ہیں

ہم بدلہائی نماید خویش را ہم بدوز دخرقہ درویش را

یعنی وہ خود ہی عشاق کے دلوں میں جلوہ گر رہتے ہیں جس کے بعد یہ عشق کا دم بھرنے لگتے ہیں پھر ان کی طلب اور ان کا عشق ناتمام ہوتا ہے تو وہ خود ہی اس کو کامل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کہ دن بدن معرفت میں ترقی کرتے جاتے ہیں جس سے طلب ومحبت کامل ہوتی جاتی ہے اور یہ کچھ اسی محبت کے ساتھ خاص نہیں مولانا عموماً دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاں بھی محبت ہوتی اول تو محبوب کی طرف سے ہوتی ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں(۱)

اور ایک بزرگ تو بطور کلیہ کے فرماتے ہیں۔

---

(۱) پیاسے اگر دنیا میں پانی کو تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی عالم میں پیاسوں کی تلاش میں ہوتا ہے۔

اگر از جانب معشوق نباشد کششے طلب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

خیر اور جگہ تو ہو یا نہ ہو مگر حق تعالیٰ کے ساتھ تو واقعی یہی ہے کہ ہم کو اول محبت نہیں ہوتی بلکہ انہی کو اول محبت ہے پھر وہی خود ہم سے مل بھی جاتے ہیں بالکل ایسی مثال ہے جیسے بچہ کو ماں بلاتی ہے اور وہ چلنے پر قادر نہ ہو مگر دوڑنا چاہتا ہے تو ایک دو قدم تو وہ اٹھاتا ہے پھر ماں خود دوڑ کر اس کو گود میں اٹھا لیتی ہے بلا تشبیہ یہی حال یہاں ہے کہ بندہ ایک دو قدم چلتا ہے پھر خود ہی اس کے پاس چلے آتے ہیں اور آغوش میں بھر لیتے ہیں ورنہ انسان سے حق محبت کیا ادا ہو سکتا ہے۔

ادائے حق محبت عنایتیست ز دوست وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خرسندست (۱)

ہمارا کیا حق تھا کچھ بھی نہیں جو کچھ بھی ہم کو مل جاتا کافی تھا مگر یہ ان کی عنایت ہے کہ وصول بھی عطا فرماتے ہیں محبت سے بھی نوازتے ہیں یہ ہیں کام کرنے کے ان میں کوشش کرو۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون (۲) اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ان دولتوں سے نوازیں اور اعمال صالحہ کی توفیق دیں (۳)۔ وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوینا ان الحمد للہ رب العلمین

(۱) دوست کی طرف سے محبت کے حق کی ادائیگی آپ ہی کی عنایت ہے ورنہ بیچارہ مسکین عاشق اس کی کہاں طاقت رکھتا ہے (۲) ایسی باتوں میں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنی چاہئے (۳) اللہ تعالیٰ محشی اور اس وعظ کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون کرنے والوں کے حق میں بھی یہ دعا قبول فرمائیں۔ آمین خلیل احمد تھانوی ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ

Ali Composer & Designer

291.Kamran Block Allama Iqbal Town Lahore.# 5414385